کسی اور زمانے کا خواب
ظفر اللہ خان

بغداد میں چالیس روز تک قتل و غارت ہوتی رہی۔ دنیا کا خوبصورت ترین شہر ویران ہوگیا۔ راستوں اور بازاروں میں لاشوں کے ڈھیر تھے جو ٹیلے کی طرح نظر آتے تھے۔ ان لاشوں پر بارش ہوئی تو صورتیں بگڑ گئیں۔ سارے شہر میں تعفن پھیلا جس سے سخت وبا پھیلی جس کا اثر ملک شام تک پہنچا۔ ابن اثیر (d. 1233) نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ اے کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا۔ یہ حادثۂ عظمیٰ ہے۔ مصیبت کبریٰ (greatest tragedy) ہے۔ دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی (تاریخ الکامل از امام ابن اثیر)۔ فتنہ تاتار (Mongol invasion) اور آج کے حالات میں مماثلت (similarity) ہے۔ دونوں اسلام کے لیے بلائیں ثابت ہوئیں۔ دونوں نے دنیائے اسلام کی چولیں ہلا دیں۔ مسلمان حیران ہیں۔ خوف و ہراس میں ہیں۔ صدمے میں ہے۔ یاس میں ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں کہ کیا ہوا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ کیوں ہوا ہے؟ اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ کہ ہم بالکل ٹھیک ہیں اور مغرب اسلام کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ دوسرا یہ کہ غلطی ہماری ہے۔ ہم کمزور ہیں۔ بے حکمت ہیں۔ میری رائے میں پہلا جواب بھی بالکل غلط نہیں ہے لیکن اصل مسئلہ ہمارے اندر ہے۔ ہم نے اپنی اور اسلام کی شکل بگاڑ دی ہے۔ ہم ماضی میں رہتے ہیں۔ غاروں کے قابل تو ہیں مگر اکیسویں صدی کے لیے تیار نہیں۔

کسی اور زمانے کا خواب

ظفر اللہ خان

نیشنل بک فاؤنڈیشن
اسلام آباد
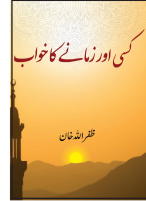
نگران	:	**ڈاکٹر انعام الحق جاوید**
مصنف	:	ظفراللہ خان
اشاعت	:	فروری، 2018ء
تعداد	:	1000
کوڈ نمبر	:	GNU-685
آئی ایس بی این	:	978-969-37-1077-9
طابع	:	روحانی آرٹ پریس، اسلام آباد
قیمت	:	-/425 روپے

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی مطبوعات کے بارے میں مزید معلومات کے لیے رابطہ:
ویب سائٹ: http/www.nbf.org.pk یا فون 92-51-9261125
یا ای میل: books@nbf.org.pk

فہرست مضامین

(اجمالی)

پہلا باب

دوسرا باب

تیسرا باب

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب

فہرست مضامین

(تفصیلی)

پہلا باب

دوسرا باب

تیسرا باب

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب

پیش لفظ

نیشنل بُک فاؤنڈیشن کی طرف سے کتب بینی کے فروغ کے لیے علم وادب، سائنس، فلسفہ، تاریخ، اخلاقیات اور دیگر اہم موضوعات پر ہر خاص وعام کے ذوقِ مطالعہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے معلوماتی کتب شائع کی جا رہی ہیں تا کہ عاداتِ مطالعہ کے فروغ کے مقاصد کے تحت کتاب تک قارئین کی رسائی کو آسان بنایا جا سکے۔

"کسی اور زمانے کا خواب" جناب ظفر اللہ خان کی ایک اہم کتاب ہے جس میں پُر امن اور بامقصد زندگی گزارنے کے لیے سماجی و اسلامی موضوعات پر مبنی خیال افروز تحریریں پیش کی گئی ہیں تا کہ افراد کی کردار سازی کے ذریعے بہتر معاشرے کی تشکیل کی راہ ہموار کی جا سکے۔ اندازِ تحقیق و تخلیق اور اسلُوب عام فہم ہے جس کے باعث پڑھنے والے کو مکمل بات بہ آسانی سمجھ آ جاتی ہے اور وہ اس سے بھرپور استفادہ کر سکتا ہے۔

ظفر اللہ خان صاحب عہدِ حاضر کے ایک نامور مصنف ہیں۔ اُردو اور انگریزی میں لکھی گئی ان کی کتابیں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ اس سے قبل "A New Narrtative" اور "کتاب الزُّہد" کے نام سے ان کی دو کتابیں این بی ایف سے شائع ہو چکی ہیں۔ ہم ان کے ممنون ہیں کہ انہوں نے کتابوں کو قارئین کے وسیع تر حلقے تک پہنچانے والے قومی ادارے این بی ایف کو اس کتاب کی اشاعت کے حقوق دیئے۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید
(پرائڈ آف پرفارمنس)
مینیجنگ ڈائریکٹر

دیباچہ

'کسی اور زمانے کا خواب' 2004ء میں جب پہلی بار شائع ہوئی تو اس کو خوب پذیرائی ملی۔ بہت سے دانشوروں نے اس پر تبصرے لکھے۔ کئی علمی رسالوں نے اس پر تبصرے شائع کیے۔ 2008ء میں اس کا انگریزی ترجمہ 'The Way Out' کے عنوان سے رائل بک پریس، کراچی نے چھاپا اور اس پر تقریظ ڈاکٹر مہاتیر محمد سابق وزیر اعظم، ملائیشیا نے لکھی۔ کتاب کا یہ انگریزی ترجمہ تعلیم یافتہ نوجوان نسل میں بہت مقبول ہوا۔

2015ء میں پاکستان میں شدت پسندی اور دہشتگردی کے خاتمہ کے لیے تمام سیاسی و عسکری قیادت نے مل کر قومی لائحہ عمل (National Action Plan) ترتیب دیا جس کا ایک اہم جز نئے قومی بیانیے کی تشکیل تھا۔ اس نئے بیانیے کا ایک پہلو عصر حاضر میں دینی فکر کی تشکیل نو ہے جس کی طرف حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات (The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam) میں بڑی شدت سے توجہ دلائی ہے۔ اسی تناظر میں، میں نے مناسب سمجھا کہ اپنی کتاب 'کسی اور زمانے کا خواب' میں کی گئی اس محنت کو مزید شرح و بسط سے بیان کیا جائے اور یہ کوشش 2016ء میں 'Islam in the Contemporary world: A New Narrative' کے نام سے نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد سے شائع ہوئی۔

اس انگریزی ترجمہ اور نئے تفصیلی کام کے باوجود بہت سے قارئین کا مطالبہ تھا کہ 'کسی اور زمانے کا خواب' کو دوبارہ شائع کیا جائے اور اس لیے یہ کتاب دوبارہ آپ کے سامنے ہے۔ اس دوسری اشاعت میں حوالہ جات اور Foot notes شامل کیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں عبارت اور واقعات میں تبدیلی کی گئی ہے اور بعض موضوعات کی مزید صراحت کی گئی ہے اور زبان آسان کر دی گئی ہے۔

میں ڈاکٹر انعام الحق جاوید مینیجنگ ڈائریکٹر این بی ایف کا انتہائی مشکور ہوں جنہوں نے میری اس کاوش کو کتابی شکل میں قارئین تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ اللہ رب العزت سے امید ہے کہ دین اسلام کی عہد حاضر کے حوالے سے میری اس کوشش کو قبولیت بخشے گا اور یہ کوشش میرے لیے اجر و مغفرت کا سبب ثابت ہوگی۔

ظفر اللہ خان

فروری، 2018

اسلام آباد

ابتدائیہ

دس ہزار میل دور سے آنے والی دیوہیکل بلاؤں نے ہزار ہزار ٹن وزنی بم گرائے۔ غاروں میں چھپے نہتے اور بھوکے پیاسے افغان غاروں میں دفن ہو گئے۔ بارود کی شدت اور قتل و غارت کے غم میں تورا بورا[1] کے پہاڑ سیاہ ہو گئے۔ مزار شریف سے ہزاروں لوگ گرفتار کیے گئے۔ کچھ لوہے کے کنٹینروں میں بند کیے گئے جہاں وہ پیاس سے بلک بلک کر مر گئے۔ جو بچ گئے ان کو ایک قلعہ میں لایا گیا اور پھر انہیں ذبح کر دیا گیا۔ شادی کی ایک تقریب میں بچے اکٹھے ہو کر کھیل رہے تھے۔ انہیں بم مار کر ہمیشہ کے لیے سلا دیا گیا کہ شائد بڑے ہو کر طالبان نہ بن جائیں۔

ابوغریب کی جیل میں قیدیوں کو ننگا کیا گیا۔ ان کی جنسی تذلیل کی گئی۔ اہل روم کی یاد میں ان پر کتے چھوڑے گئے۔ خواتین سے درندگی جیسا سلوک کیا گیا۔ وہ یا حجاج یا حجاج پکارتی رہیں لیکن حجاز کے حجاج ان کی چیخ و پکار نہ سن سکے۔ طالبان بے عقل تھے۔ صدام ظالم تھا۔ لیکن معصوم افغانی و عراقی تو بے گناہ تھے۔

یہ واقعات مجھے 1258ء/ 686ھ کا بغداد یاد دلاتے ہیں۔ بغداد میں چالیس روز تک

۱۔ مشرقی افغانستان میں موجود پہاڑی سلسلے کو تورا بورا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں موجود غاروں کو طالبان اپنے ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ امریکہ نے افغانستان پر حملے کے دوران ان پہاڑوں پر انتہائی خطرناک ہتھیاروں کا استعمال کیا۔

قتل وغارت ہوتی رہی۔ دنیا کا خوبصورت ترین شہر ویران ہو گیا۔ راستوں اور بازاروں میں لاشوں کے ڈھیر تھے جو ٹیلے کی طرح نظر آتے تھے۔ ان لاشوں پر بارش ہوئی تو صورتیں بگڑ گئیں۔ سارے شہر میں تعفن پھیلا جس سے سخت وبا پھیلی جس کا اثر ملک شام تک پہنچا[1]۔ ابن اثیر[2] (d. 1233) نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ اے کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا۔ یہ حادثہ عظمیٰ ہے۔ مصیبت کبریٰ (greatest tragedy) ہے۔ دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی[3]۔

فتنہ تاتار (Mongol invasion) اور آج کے حالات میں مماثلت (similarity) ہے۔ دونوں اسلام کے لیے بلائیں ثابت ہوئیں۔ دونوں نے دنیائے اسلام کی چولیں ہلا دیں۔ مسلمان حیران ہیں۔ خوف وہراس میں ہیں۔ صدمے میں ہے۔ یاس میں ہیں۔

مسئلہ یہ نہیں کہ کیا ہوا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ کیوں ہوا ہے؟ اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ کہ ہم بالکل ٹھیک ہیں اور مغرب اسلام کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ دوسرا یہ کہ غلطی ہماری ہے۔ ہم کمزور ہیں۔ بے حکمت ہیں۔ میری رائے میں پہلا جواب بھی بالکل غلط نہیں ہے لیکن اصل مسئلہ ہمارے اندر ہے۔ ہم نے اپنی اور اسلام کی شکل بگاڑ دی ہے۔ ہم ماضی میں رہتے ہیں۔ غاروں کے قابل تو ہیں مگر اکیسویں صدی کے لیے تیار نہیں۔

ہم سب اس کے ذمہ دار ہیں۔ عام مسلمان بھی، اہل اقتدار بھی اور علما بھی۔ میری رائے میں زیادہ قصوروار اہل دین ہیں۔ جو دین سے بے خبر ہیں۔ مقام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے خبر ہیں۔ اہل اقتدار بھی

---

[1]۔ البدایہ والنہایہ از امام ابن کثیرؒ۔ جلد 13۔ صفحہ نمبر 248

[2]۔ عز الدین ابو الحسن علی بن محمد بن عبد الکریم الجزری المعروف بہ ابن اثیر (1160ء-1233ء) تاریخ اسلام کے مشہور تاریخ دان ہیں۔ مورخین میں ابن جریر طبری کے بعد ابن اثیر کا نام سب سے نمایاں ہے۔

[3]۔ تاریخ الکامل از امام ابن اثیرؒ۔ جلد 13۔ صفحہ نمبر 202

اہل ہوس ہیں۔ عام مسلمان بھی حیوانی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ان کو فکری راہنمائی نہیں ملی جس کے ذمہ دار دیندار طبقات ہیں۔

ہمیں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ نہایت بے رحمی سے اپنی غلطیوں کا احتساب کریں۔ دوسروں کو فی الحال بھول جائیں اور صرف اپنی ذات پر توجہ کریں اور دیکھیں کہ ہم میں کون سی خامیاں ہیں۔ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے یا ہو رہا ہے۔ اس میں ہمارا اپنا کتنا قصور ہے۔

بہت عرصہ سے میں سوچ رہا تھا کہ اس موضوع پر لکھوں۔ طالبان کے دور حکومت میں ان نادان دوستوں کی پالیسیوں پر میری یہاں کے اہلِ اسلام سے تلخ تر بحث جاری رہی۔ 11/9 سے چند ہفتے قبل ایک سینئر آفیسر کے ہاں کچھ اہل اسلام اکٹھے تھے۔ ساری رات بحث جاری رہی۔ صبح ہونے لگی تو میں نے پیشن گوئی کی کہ اگر ملا عمر صاحب[1] (d. 2013) نے اپنی پالیسیاں نہ بدلیں تو افغانستان اور اسلام پر بہت مشکل وقت آنے والا ہے۔ وہی ہوا جس میں میری روحانیت کو ذرا بھی دخل نہیں تھا بلکہ یہ نظام قدرت کا تقاضا تھا۔

اللہ عزوجل اس نظام کو ایک خاص ضابطے (سنۃ اللہ) سے چلا رہے ہیں۔ جہاں عام طور پر دو جمع دو چار ہی ہوتے ہیں۔ جناب ڈاکٹر برہان الدین فاروقی کا میں نے ایک بار بچپن میں اردو ڈائجسٹ میں انٹرویو پڑھا تھا جس نے میری کایا پلٹ دی۔ انٹرویو کا لب لباب یہ تھا کہ دنیاوی نظام اور روحانی نظام دونوں کے اپنے اپنے ضابطے ہیں۔ ہم جب ان ضابطوں کو توڑتے ہیں تو فطرت اپنا ردعمل ظاہر کرتی ہے۔ اللہ میاں ایک ضابطے کے تحت کام کرتے ہیں۔ لیکن ہم مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ غالباً یہ نظام تک بندی پر چل رہا ہے۔ کوئی قانون قدرت نہیں ہے۔ ہم جو چاہیں کریں اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ اس لیے ہم خدا کے بنائے ہوئے ہر طبعی (physical) اور شرعی ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے خوش فہمی میں مبتلا

---

[1] ۔ ملا محمد عمر (1960ء-2013ء) افغانستان کی طالبان تحریک کے رہنماء تھے۔ وہ 1996ء سے 2001ء تک افغانستان کے حکمران رہے۔ پھر امریکی و نیٹو افواج نے ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

رہتے ہیں کہ کافروں کی توپوں میں کیڑے پڑیں گے۔ یہ محال (impossible) ہے بلکہ جنون (madness) ہے۔

اس موضوع پر لکھنے کی تحریک اس وقت زیادہ ہوئی جب اس سال (2004) کے شروع میں محترم ارشاد احمد حقانی[1] (d. 2010) نے روزنامہ جنگ اخبار میں عہد حاضر میں دین کی تعبیر کے حوالے سے کچھ مضامین لکھے۔ اپریل میں دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد اور انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز نے علماء کے لیے ایک ورکشاپ کا اہتمام کیا۔ جہاں مجھے بھی معروضات پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ علماء کے سامنے ان کا احتساب مشکل کام ہے لیکن میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے دو گھنٹے تک میری تلخ نوائی گوارا کی۔ آخر میں علما کے ایک نمائندے نے بھری محفل میں ایک حقیقت پسندانہ بات کہی: ہم کسی کی بات نہیں سنتے۔ آپ کی سن لی کہ آپ ہمارے اپنے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ نے ہمیں آئینہ دکھا دیا ہے۔ اس تقریر کو میں نے جب مضمون کی شکل میں چھاپنا چاہا تو مشہور ادیب جناب مظہر الاسلام صاحب[2] نے ارشاد فرمایا کہ یہ مفید باتیں ہیں ذرا تفصیل سے لکھ دیں۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل میں اس اہم موضوع پر تفصیل سے لکھنے کا فیصلہ کرلیا۔

مجھے اس بات کا اندازہ ہے کہ اس کتاب کے مندرجات پر بہت سے اہل علم کو اختلاف ہوسکتا ہے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اس پر علمی بحث کا آغاز ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کتاب سے بہت سے شکوک و شبہات جنم لیں۔ اس لیے میں اس تحریر کا فکری پس منظر واضح کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

میں پیدائشی طور پر مسلمان ہوں۔ اسلام کی ابدی حقیقت پر ایمان رکھتا ہوں۔ میں نے طویل عرصہ علماء وصوفیا کرامؒ سے کسب فیض کیا ہے۔ میں اس بات پر کامل یقین رکھتا ہوں کہ علماء کے ایک طبقہ نے ناقابل بیان (unexplainable) مشکل حالات میں مینارہ نور (beacon of light) کو روشن

---

[1]۔ ارشاد احمد حقانی (1928ء-2010ء) ایک مشہور پاکستانی صحافی، دانشور اور کالم نویس تھے۔

[2]۔ مظہر الاسلام (1949ء-حیات) پاکستان کے مشہور اردو افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں۔

رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جو کچھ بھی دین ہم تک پہنچا ہے یہ ان کے ذریعے سے ہے۔ اس لیے یہ ہمارے محسن ہیں مگر اہل اسلام کو اصلاح کی بھی بہت ضرورت ہے۔

میرا یہ بھی ایمان ہے کہ اسلام کی بنیادیں محکم (stable) ہیں۔ ہمیں مغرب کے زیر اثر نیا دین متعارف کرانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ البتہ یہ انتہائی لازم ہے کہ ہم دین کی سنہری تعلیمات کی روشنی میں عہد حاضر میں دین کی از سر نو تشریح کریں۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید (reconstruction) کریں اور اس کے لیے ہمارے علماء کرام بہتر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اب ہمارے لیے آسمان سے کوئی نہیں اترے گا۔ میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں تزکیہ نفس واحسان (تصوف) کا حامی ہوں۔ لیکن اس کو متبادل دین نہیں مانتا۔ آئمہ امت سے محبت کرتا ہوں۔ ان کا احترام کرتا ہوں لیکن دین کا منبع صرف اور صرف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سمجھتا ہوں۔

بہت سارے مسائل جن پر یہاں بحث کی گئی ہے وہ مسلمانوں کے علاوہ افریقہ، ایشیاء اور لاطینی امریکہ کی دیگر اقوام کے لیے بھی مشترک ہیں۔ لیکن میں نے صرف مسلمانوں کے حوالے سے بات کی ہے۔ اس کی تین وجوہات ہیں: (1)۔ اس کتاب میں میرا خطاب صرف مسلمانوں سے ہے؛ (2)۔ مسلمانوں کا شاندار ماضی تھا۔ اب حالت بہت خستہ ہے اور (3)۔ مسلمان بحیثیت قوم اس وقت ایک بہت بڑی آزمائش سے گزر رہے ہیں۔

اس کتاب میں خطاب اہل اسلام سے ہے۔ خاص طور پر علماء، صوفیاء اور دین کی تعبیر کرنے والوں کے سامنے اپنی معروضات رکھی ہیں۔ خرابی کسی ایک طبقے میں نہیں بلکہ مسلم معاشرہ بحیثیت مجموعی اضمحلال اور بیماری کا شکار ہے۔ علماء چونکہ سالار قافلہ ہیں اسی لیے عام طور پر گفتگو کا رخ ان کی جانب ہو جاتا ہے۔

یہ معروضات مسلمانوں کی بے بسی کا نوحہ ہیں۔ اس لیے ان میں کہیں کہیں شدت غم سے تلخی پیدا ہو گئی ہے جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ درخواست ہے کہ اسے محبت کی ایک ادا سمجھا جائے چونکہ

سامعین میں نغمہ سننے کا ذوق وشوق نہ ہوتو پھر لے کو تیز اور تیکھا کرنا پڑتا ہے۔

اس کتاب میں دین کی موجودہ تعبیر پر تنقید کی گئی ہے اور فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی بات کی گئی ہے۔اس نزاکت کے پیش نظر میں نے اس کتاب کا مسودہ جناب تقی عثمانی (سابق جج شریعت اپیلٹ بینچ سپریم کورٹ)، جناب محمود احمد غازی (سابق وفاقی وزیر مذہبی امور)، جناب قاری حنیف جالندھری (وفاق المدارس)۔ جناب جاوید احمد غامدی (المورد)، جناب ارشاد احمد حقانی (روز نامہ جنگ)، ڈاکٹر انیس احمد (رفاۃ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی)، جناب میاں اللہ نواز (سابق چیف جسٹس لاہور کورٹ) اور ڈاکٹر خالد محمود شیخ (ازراء انٹرنیشنل امریکہ) کو بھیجا۔ جناب تقی عثمانی اور جناب قاری حنیف جالندھری صاحب نے اپنی مصروفیات کے سبب معذرت کر لی۔ ڈاکٹر انیس احمد صاحب کے علمی مشوروں کی روشنی میں نفس مضمون میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ جب کہ دیگر اصحاب کی آراء کتاب میں شامل کر دی گئی ہیں۔

کتاب کی تیاری اور طباعت میں مدد کرنے پر میں جناب وقار اسلم حمدی، بشیر احمد ندیم، مظہر الاسلام، علی اصغر چشتی، شعیب بن عزیز، وقار احمد اور سید محمود حسین کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔

میں اہل علم سے مخلصانہ گزارش کرتا ہوں کہ میری ان معروضات پر کھلے دل سے غور کریں۔ کتاب کے نفس مضمون پر بحث کو آگے بڑھائیں تا کہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی طرف بڑھا جا سکے جو عہد حاضر کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

ظفر اللہ خان
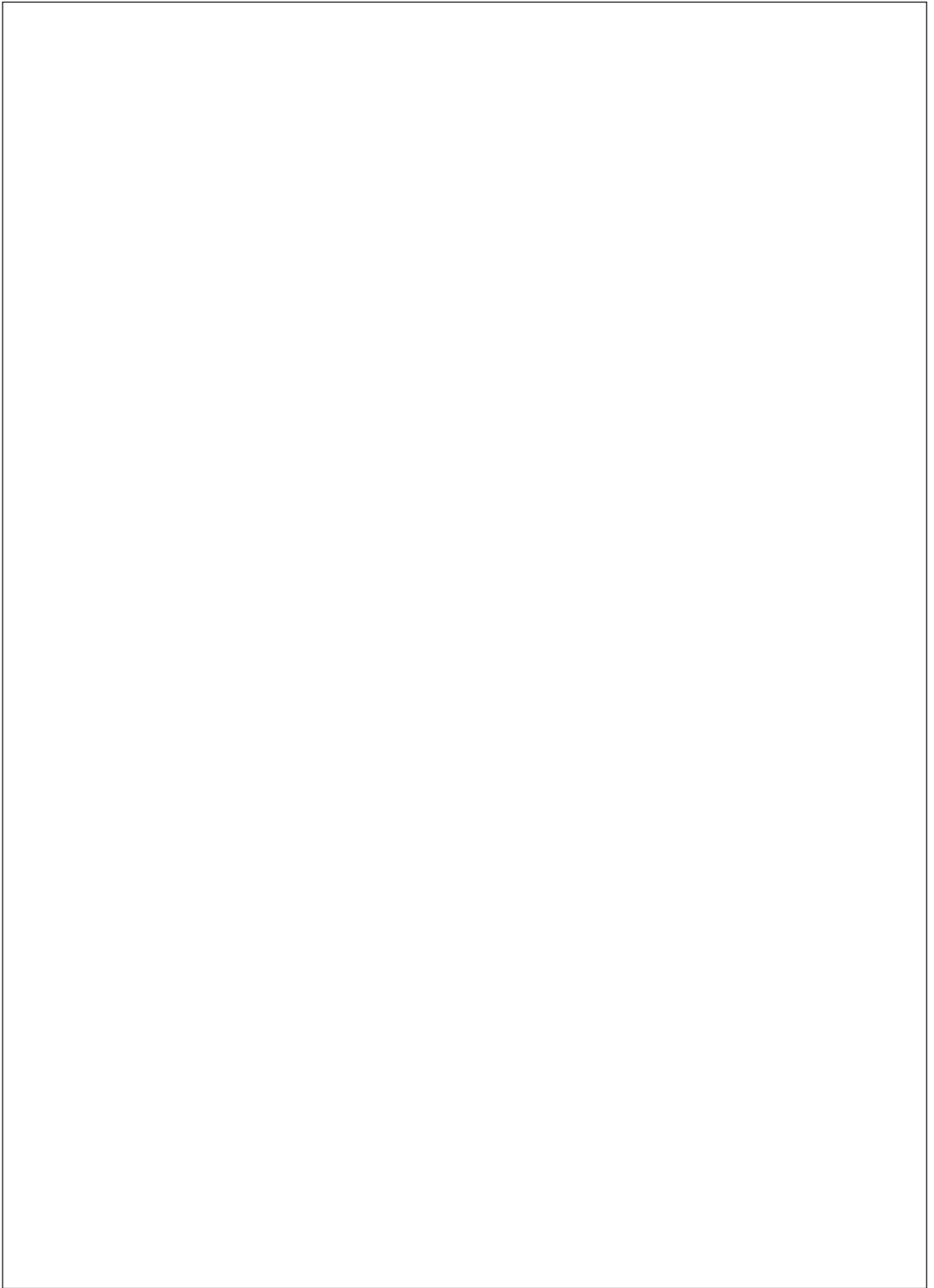
اسلام آباد
نومبر 2004[1]

---

[1]۔ یہ کتاب پہلی بار 2004ء میں چھپی تھی اور یہ ابتدائیہ پہلے ایڈیشن میں شامل تھا۔

۱

زندگی کے بنیادی اصول

1۔ حرکت

1972ء کی بات ہے جب میں نے چھٹی جماعت میں داخلہ لیا تو ایک استاد محترم اکثر حضرت اقبالؒ کی یہ نظم بلند آواز میں گھن گرج کے ساتھ پڑھ کر سناتے تھے:

چاند اور تارے

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے — تارے کہنے لگے قمر سے
نظّارے رہے وہی فلک پر — ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا — چلنا ، چلنا ، مدام چلنا
بے تاب ہے اس جہاں کی ہر شے — کہتے ہیں جسے سکوں ، نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کشِ سفر سب — تارے ، انساں ، شجر ، حجر سب

ہو گا کبھی ختم یہ سفر کیا
منزل کبھی آئے گی نظر کیا

کہنے لگا چاند ، ہم نشینو — اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی — یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ — کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں — جو ٹھہرے ذرا ، کچل گئے ہیں

انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق ، انتہا حسن[1]

مفہوم تو اس پیاری نظم کا میری ننھی سی عقل میں نہ آیا لیکن بول یاد ہو گئے۔ اس طرح کہ آج بھی استاد محترم کی وہ گرجدار آواز میرے ذہن میں گونجتی ہے: چلنا چلنا مدام چلنا------ جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں۔

1975ء میں نے مدرسہ میں داخلہ لے لیا۔ منطق (Logic) کی تعلیم شروع ہوئی تو سب سے پہلے جو کتاب ہم نے پڑھی اس کا نام ایساغوجی تھا۔ اس کی ایک سطر کچھ اس طرح تھی کہ عالم متغیر ہے۔ مجھے کتاب کا نام تو مزاحیہ لگا لیکن اس کی اس بات نے مجھ پر سنجیدگی طاری کر دی کہ دنیا ہر لمحے متغیر (changing) ہے۔ 1975 اور آج کا دن۔ میں اس تصور کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک بات جب کچھ سمجھ میں آتی ہے تو اتنے میں اس میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ ان بیس سالوں میں شعوری اور عملی طور پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کائنات کی اصل تبدیلی ہے۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے:

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ[2]

(ہر آن وہ نئی شان میں ہے)

دنیا کبھی ایک حال پر نہیں رہتی۔ ہر لمحہ اس کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور اس کا خالق ہر بار اسے ایک نئی صورت میں ترتیب دیتا ہے۔ جو پچھلی تمام صورتوں سے مختلف ہوتی ہے۔

---

[1] ۔ چانداور تارے؛ بانگ درا از محمد اقبالؒ

[2] ۔ سورۃ الرحمٰن: آیت:29

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَعِبۡرَةً لِّاُولِى الۡاَبۡصَارِ [1]

(رات اور دن کا الٹ پھیر وہی کر رہا ہے۔ اس میں ایک سبق ہے آنکھوں والوں کے لیے)

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کائنات میں جمود (Inertia) نہیں ہے بلکہ حرکت ہے۔ مستقل حرکت ہے۔ مستقل بہاؤ ہے جس میں کوئی ٹھہراؤ نہیں ہے۔ وقت آگے بڑھ رہا ہے۔ ہر لمحہ ایک نئی دنیا ہے۔ حرکت ہی حرکت ہے جس میں کوئی رکاوٹ ہے نہ کوئی تقسیم۔ اب تو سائنس نے بھی کہہ دیا ہے کہ مادہ بھی مستقل نہیں ہے بلکہ تغیر پذیر (changable) ہے۔ تبدیلی کے خالق نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس تبدیلی کو صرف عقل والے سمجھ سکتے ہیں۔ بے عقل لوگ جامد (motionless) رہتے ہیں۔ حال پر خوش رہتے ہیں۔ تبدیلی کا ساتھ نہیں دیتے۔

ہر تبدیلی ایک لمحہ پہلے ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ ثبات (constant) ہوتا ہے۔ ماضی ہوتا ہے۔ تبدیلی کے لیے استقلال (constancy) لازم ہے۔ حال کے لیے ماضی لازم ہے۔ اس لیے تغیر (chang) کے ساتھ ساتھ ثبات بھی حقیقت ہے۔ صرف ثبات پر رہنا جمود (inertia) ہے۔ صرف تبدیلی پر رہنا بے یقینی (uncertainty) ہے۔ اگر انسان ثبات پر رہے گا اور تغیر کو نظر انداز کرے گا تو قصہ پارینہ بن جائے گا۔ اگر صرف تغیر کا ساتھ دے گا تو ماضی سے کٹ کر کٹی ہوئی پتنگ بن جائے گا۔ اس لیے معلوم ہوا کہ ثبات و تغیر دونوں کائنات کی اصل حقیقت ہیں۔ ہر وقت ان کا باہمی عمل حیات انسانی میں حسن و توازن برقرار رکھتا ہے۔

انسانی اور خلاقی سطح پر اس تبدیلی کا ایک خاص مطلب ہے۔ مقصد ہے۔ یہ چھانٹ (filter) کا ایک عمل ہے جس سے فطرت کار آمد (useful) اور بے کار (useless) کو الگ کرتی ہے۔ انسانوں کی آزمائش کرتی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

---

[1] سورۃ النور: آیت: 44

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ[1]

(ہم دنوں کو لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں تاکہ ہم چھانٹ سکیں کہ اللہ کی قدرت و نظام کو کون سمجھتا ہے اور کون اس کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے۔ جو ایسا نہیں کرے گا وہ ظالم ہوگا)

اس آیت کریمہ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ صرف وہی لوگ زندہ رہیں گے جو تبدیلی کا ساتھ دیں گے۔ جو تبدیلی کا ساتھ نہیں دیں گے وہ اپنے آپ پر ظلم کریں گے اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

2۔ جدوجہد

ہر لمحہ کی اس تبدیلی کے لیے ہر لمحہ جدوجہد (struggle) کرنا پڑتی ہے۔ ہماری مسلم تاریخ کے عظیم فلسفی اور سائنسدان ابن مسکویہ[2] (ibn-e-Miskawayh, d. 1030) نے صحیح فرمایا ہے کہ کائنات میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر جہد للبقاء (struggle for existence) جاری ہے۔

---

[1]۔ سورۃ آل عمران: آیت: 140

[2]۔ (Abu Ali Ahmad ibn-e-Muhammad Ibn-e-Yaqub ibn-e-Miskawayh) ابوعلی احمد بن محمد بن یعقوب مسکویہ (932ء-1030ء) کو مورخین موجودات عالم پر سائنسی نقطہ نظر سے بحث و تحقیق کرنے والا حکیم، حیاتیات کا ماہرِ خصوصی، نباتات میں زندگی دریافت کرنے والا پہلا سائنس دان، زندگی کی تحقیق اور دماغی ارتقا کی تشریح اور درجہ بندی کرنے والا، نباتات، علم سماجیات اور معاشرت کا محقق، علم تمدن اور ثقافت کے نکتے بیان کرنے والا، علم نفسیات کا ماہرِ خصوصی تسلیم کیا ہے۔ زندگی کے ارتقا کا نظریہ سب سے پہلے معلم ثانی ابونصر فارابی نے پیش کیا اور ابن مسکویہ نے اس کی تشریح کی اور دلائل کے ذریعہ ثابت کیا۔ ابن مسکویہ کی مشہور ترین کتابوں میں کتاب تجارت الامم، آداب والعرب والفرس اور تہذیب الاخلاق ہیں۔

اس جدوجہد میں صرف وہ چیز زندہ رہتی ہے جو بہترین ہے۔ یہی وہ اصول ہے جسے عہد حاضر میں چارلس ڈارون[1] (Charles Darwin, d. 1882) نے (survival of the fittest) کا نام دیا ہے۔ ہم ان اصولوں کی حیاتیاتی (biological) تعبیر تو نہیں مانتے لیکن انسانی اور اخلاقی سطح پر ان اصولوں کا ادراک (understanding) ہم ہر روز خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ جو قومیں مادی ترقی نہیں کرتیں وہ صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔ جو معاشرے اعلیٰ اخلاق سے محروم ہو جاتے ہیں وہ ناپید ہو جاتے ہیں۔

قرآن مجید کی بیان کردہ انسانی اور نبوی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ صرف اور صرف اعلیٰ اخلاقی اقدار میں ہی انسانیت کی بقا ہے۔ قرآن پاک نے اصول بیان کیے ہیں:

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۬ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ[2]

(اللہ تعالیٰ حق و باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے۔ جو جھاگ ہے وہ اڑ جاتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نفع دینے والی ہے وہ زمین میں قائم رہتی ہے)

کیا خوبصورت اصول بیان کیا گیا ہے۔ جھاگ جیسی غیر ضروری چیزیں ختم ہو جاتی ہیں۔ غیر مفید چیزیں ختم ہو جاتی ہیں۔ انسانیت کے لیے مفید چیزیں زندہ رہتی ہیں۔ اگر ایک فرد جھاگ بن کر رہ جائے گا تو مٹ جائے گا۔ اگر کوئی قبیلہ، قوم یا مذہب بے کار ہو جائیں تو وہ مٹ جائیں گے۔ اس

---

[1] ۔ Charles Robert Darwin؛ چارلس ڈارون (1809ء–1882ء) ایک انگریز ماہر حیاتیات تھا۔ اس نے قدرتی انتخاب (Natural Selection) کا نظریہ پیش کیا جس کے مطابق جو چیز زیادہ خوبیوں کی حامل اور طاقتور ہے وہی اس دنیا میں باقی رہتی ہے۔

[2] ۔ سورۃ الرعد: آیت: 17

طرح اگر کوئی فرد اپنے اندر انسانیت کے لیے نفع پیدا کر لے گا تو وہ دنیا میں امر (eternal) ہو جائے گا اگر کوئی قوم یا مذہب انسانیت کے لیے مفید بن جائے گا تو لازوال ہو جائے گا۔

هرگز نمیرد آن که دلش زنده با عشق

ثبت است برجریده عالم دوام ما[1]

(جس کا دل عشق سے زندہ ہو جائے وہ کبھی بھی نہیں مرتا۔ ہم چونکہ انسانیت کے عشق میں مبتلا ہیں اس لیے دنیا کے نقشہ پر ہم ہمیشہ زندہ رہیں گے)

انسانوں میں صلاحیت حیات، توانائی اور عظمت ان اعمال سے پیدا ہوتی ہے جن کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ یعنی علم، عبادت، صداقت، دیانت، محبت، خدمت، عدل اور گناہ سے نفرت۔ سچائی قوت ہے اور جھوٹ کمزوری ہے۔ عدل قوت ہے اور ظلم کمزوری ہے۔ دنیا میں وہی اقوام قائم رہتی ہیں جو اچھے اعمال سے اپنے اندر زندگی کی قوت و صلاحیت پیدا کر لیں۔ سورۃ الانبیاء میں ارشاد پاک ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ[2]

(ہم نے زبور میں (اچھائی اور برائی کے) ذکر کے بعد یہ بات لکھ دی تھی کہ زمین کے وارث وہی لوگ ہوں گے جو اچھے اعمال (قوت والے اعمال) کریں گے)

ان اصولوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا میں وہی قومیں اور مذہب قائم رہتے ہیں جو انسانیت کے لیے مفید ہوتے ہیں۔ جن میں صلاحیت حیات ہوتی ہے۔ علم ہوتا ہے۔ صداقت

۱۔ غزلیات از حافظؒ

۲۔ سورۃ الانبیاء: آیت: 105

ہوتی ہے۔ خدمت ہوتی ہے۔ عدل ہوتا ہے۔ وہ قومیں اور مذاہب مٹ جاتے ہیں جو انسانیت کے لیے مفید نہیں رہتے۔ جن میں جہالت آ جاتی ہے۔ جھوٹ آ جاتا ہے۔ مردم بیزاری آ جاتی ہے۔ انسانیت کا کارواں شاہراہ وقت پر ازل سے رواں دواں ہے۔ اگر کسی قوم کی رفتار کم تر ہو جاتی ہے تو تیز رفتار والی قومیں اس کو پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ اگر کسی کمزور قوم کو کوئی حادثہ پیش آ جائے تو پیچھے سے آنے والے ذرا سی دیر کے لیے رکتے ہیں۔ بعض اوقات افسوس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ مگر پھر اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ یہی رویہ ہمارا دنیاوی سڑک پر ہوتا ہے۔ گاڑی کو جب کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے تو دوسری گاڑیوں والے ذرا دیر کے لیے رکتے ہیں مگر پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

یہ بات تو طے ہو گئی کہ ثبات و تغیر زندگی کے لیے لازم ہیں۔ تغیر وہی اچھا ہے جس میں انسانیت کے لیے نفع ہو اور وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جن میں علم و خدمت کی طاقت ہو۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کو کیسے یقینی بنایا جائے کہ ہم تغیر کا ساتھ دے رہے ہیں؟ ہم اچھائی کی طرف گامزن ہیں اور ہم انسانیت کے لیے مفید ہیں۔ اس لیے احتساب کا عمل ہوتا ہے۔ احتساب دو طرح سے ہوتا ہے۔ اپنا احتساب خود آپ کر لیا جائے یا پھر کوئی اور کرے۔

اسلام خود احتسابی (self-accountability) سکھاتا ہے۔ محاسبہ نفس سکھاتا ہے۔ اللہ پاک نے انسان کے اپنے آپ کو ملامت کرنے کے عمل کو محبوب رکھا ہے[1]۔ صوفیا کرامؒ کی تعلیمات میں یہ بات بہت اہم ہے کہ ہم ہر روز سونے سے پہلے مراقبہ (introspection) کریں۔ احتساب

---

[1]- یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○
(مومنو! تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو، جو کیا نہیں کرتے۔ اللہ اس بات سے سخت بیزار ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں) سورۃ الصفؔ: آیت 2-3

کریں کہ آج میں نے کیا اچھا کیا ہے اور کیا برا کیا ہے۔صوفیاء کے ہاں دو اصول ہیں: نگہ برقدم (ہر قدم پر نظر) اور نگہداشت (خیال رکھا) یعنی کہ ہر لمحے اور ہر قدم پر ہمیں سوچنا چاہیے۔ اپنا احتساب کرنا چاہیے کہ کیا ہم ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ تعلیمات ہمیں ہر لمحے اپنے نفس کا احتساب سکھاتی ہیں جو شخصی اور قومی بقا کے لیے لازم ہے۔حضرت اقبالؒ نے صحیح فرمایا ہے:

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب[1]

احتساب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمیں معلوم ہوتا رہے کہ کیا ہم زمان و مکاں (time and space) کی تبدیلیوں کا ساتھ دے رہے ہیں؟ کیا نئے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں؟ کیا ہم نئے چیلنج کا جواب صحیح طور پر دے رہے ہیں؟

اسلام نے ثبات اور تغیر کے اصولوں کو اپنایا ہے۔ثبات کے لیے اس نے ہمیں ایسی تعلیمات دی ہیں جو محکم ہیں۔ابدی ہیں۔جن میں وقت اور جگہ کے ساتھ کوئی تبدیلی نہیں آتی۔مثال کے طور پر خدائے واحد کی ذات پر یقین۔جزا و سزا پر یقین۔زندگی بسر کرنے کے لیے بنیادی حرام و حلال پر یقین۔ یہ وہ اصول ہیں جو محکم ہیں۔ان میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہ ثبات کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔انسانی نفسیات اور اجتماعی زندگی کو ایک محکم بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

تغیر و تبدیلی کا ساتھ دینے کے لیے اسلام نے ہمیں اجتہاد کا تصور دیا ہے۔معروف (customs) کو ماننے کا تصور دیا ہے۔ان بنیادی اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے زندگی کی متحرک (dynamic) تعبیر کرنے کو کہا ہے۔زمانے کے ہر نئے چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کو کہا ہے۔قرآن و حدیث کی

۱۔ مسجد قرطبہ؛ بال جبریل از محمد اقبالؒ

عہدی تعبیر (cotemporal interpertation) کا حکم دیا ہے۔ اگر قرآن وحدیث سے راہنمائی نہ ملے تو عقل وقیاس (inference) سے کام لینے کا حکم دیا ہے۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا تو فرمایا: جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو جائے تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ پاک کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم اللہ کی کتاب میں وہ مسئلہ نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ مسئلہ سنت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں بھی نہ پاؤ اور کتاب اللہ میں بھی نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی کوتاہی نہیں کروں گا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سینہ کو تھپتھپایا اور ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ جس نے اللہ کے رسول کے قاصد (معاذ) کو اس چیز کی توفیق دی، جس سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) راضی ہیں[1]۔

اس ضمن میں اس دوسری حدیث بھی قابل غور ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھجوروں کے درختوں کی باہمی عمل گل زیرہ پوشی (pollination) کو ناپسند فرمایا۔ لوگوں نے اس عمل کو چھوڑ دیا جس سے کھجوروں کی فصل کم ہو گئی۔ لوگوں نے شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر یہ کام ان کو نفع دیتا ہے تو وہ لوگ یہ کام کریں کیونکہ میرے گمان (ظن) پر تم مجھے نہ پکڑو۔ لیکن جب میں تم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم بیان کروں تو تم اس پر عمل کرو۔ کیونکہ میں اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنے والا نہیں ہوں[2]۔

۱۔ سنن ابوداؤد۔ جلد سوم: رقم: 199

۲۔ صحیح مسلم۔ جلد سوم: رقم: 1625

اس اصول سے ثابت ہوا کہ زمانے کا معروف علم سیکھنا اور اسی پر عمل کرنا لازم ہے۔ اجتہاد اور معروف کو ماننے کے اصول تغیر کا ساتھ دینے کے لیے ہیں۔ انہیں اصولوں پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں نے عہد اول میں ہر مسئلے کا حل ڈھونڈا بلکہ نئے علوم پیدا کیے اور دنیا کے امام بن گئے۔ ہم نے اجتہاد کا دروازہ بند کرلیا اور معروف کو ماننا چھوڑ دیا۔ ہم ماضی کا قصہ بن گئے۔ انہوں نے ہر چیلنج کا مناسب جواب (response) دیا اور اپنے علم وعمل کو آگے بڑھایا۔ ہم ماضی کی پرستش کررہے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا نے بہت کام کیا ہے۔ پدرم سلطان بود (میرے والد بادشاہ تھے) ہم خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہیں۔
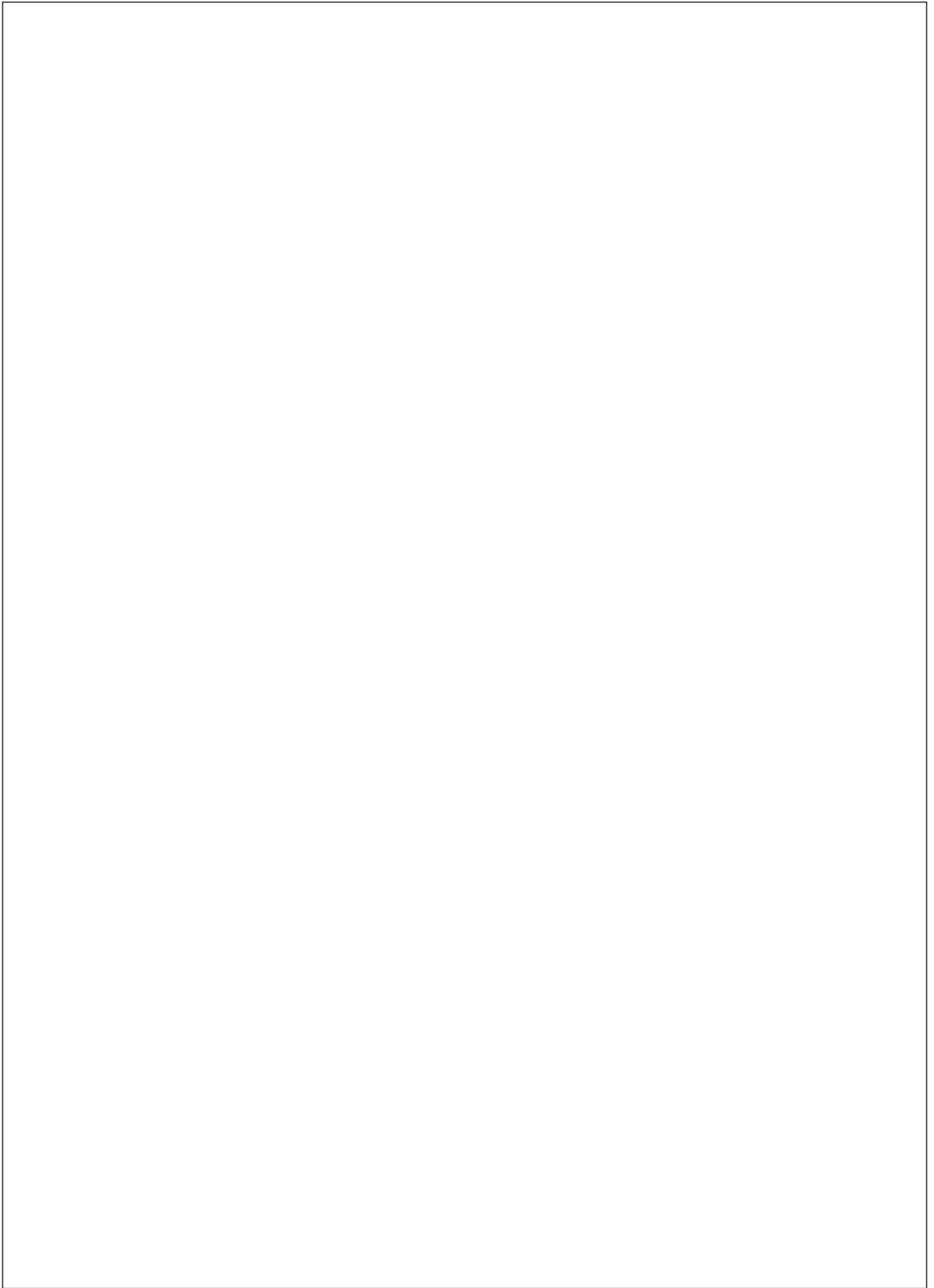
جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات، کشمکش انقلاب [1]

---

[1] ۔ مسجد قرطبہ؛ بال جبریل از محمد اقبالؒ

۲

عہد اول کے چیلنج

حرکت اور کشمکش کے اصولوں کی روشنی میں ہم نے ماضی میں ہر چیلنج کا جواب (response) دیا ہے۔ جس کی وجہ سے زمانے میں ہمارا سکہ چلتا رہا۔ یہاں میں صرف دو چیلنجوں کا ذکر کروں گا۔ سیاسی چیلنج اور علمی چیلنج اور پھر کچھ مثالیں پیش کروں گا۔ ابتدائی عہد کے مسلمانوں نے ان خطرات کا کیسے جواب دیا اور ان کو اپنے لیے کیسے مفید بنایا تا کہ ہم دیکھ سکیں کہ آج ہماری کیا حالت ہے۔ کیا ہم خود احتسابی (self-accountability) کر رہے ہیں؟ اور کیا ہم حالات کے تغیر (change) کا جواب دے رہے ہیں؟

1۔ سیاسی چیلنج

آیئے ہم عہد اول کے سیاسی چیلنج اور اس کے اسلامی جواب کا مختصراً جائزہ لیں۔

(i) ملوکیت

اسلام کی آمد کے وقت ہمسائیہ ممالک میں سیاسی نظام ملوکیت (kingship) کے اصولوں پر قائم تھا۔ خاندانی بادشاہتیں تھی۔ جہاں عوام کی حیثیت جانوروں جیسی تھی۔ جنہیں امور مملکت (state affairs) میں کوئی دخل نہ تھا۔ اسلام نے اعلان کیا کہ

- وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ [1]
- مسلمانوں کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔
- مسلمانوں کی اکثریت (سواداعظم) کی بات مانی جائے گی [2]۔
- آپ پر فرض ہے کہ جماعت اور امت کی اکثرت کی بات مانیں [3]۔
- عمومی معاملات طے کرنے سے پہلے مشورہ کریں۔ جب کوئی لائحہ عمل (عزم) طے کرلیں تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں [4]۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ عزم سے کیا مراد ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عزم سے مراد عقل مندوں سے مشورہ کرنا اور ان کی بات ماننا ہے [5]۔

اسی سیاسی شورائی فکر نے دنیا میں عوامی انقلاب برپا کردیا۔ قیصر وکسریٰ [6] کی سلطنتیں اس انقلابی ریلے میں بہہ گئیں۔ خاندانی بادشاہوں کی جگہ پر غلام ابن غلام [7] حکمران بن گئے۔ زمانے نے

---

[1] سورۃ الشوریٰ: آیت 38

[2] سنن ابن ماجہ۔ جلد سوم: رقم: 830 (حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ میری امت گمراہی پر مجتمع (متفق) نہ ہوگی۔ جب تم اختلاف دیکھو تو سواد اعظم کا ساتھ دو)

[3] مسند احمد۔ جلد ہشتم: رقم: 1207 (سواد اعظم کی پیروی کرو سواد اعظم کی پیروی کرو)

[4] سورۃ آلِ عمران: آیت: 159 (وَشَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ‌ۚ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ‌ؕ)

[5] تفسیر ابن کثیر از امام ابن کثیرؒ بحوالہ سورۃ آل عمران: آیت: 159

[6] زمانہ قدیم میں قیصر سلطنت روم کے بادشاہ اور کسریٰ ایران کے بادشاہ کا لقب تھا۔

[7] یعنی غریب لوگ حکمران بن گئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے لوگ ایک بہت بڑی سلطنت کے خلیفہ بن گئے۔

بھری بزم میں خلیفہ کا احتساب[1] دیکھا۔ پھر کیا ہوا؟ ہمارے ہاں بھی رومی و ایرانی روایات آ گئیں۔ ہم نے بھی خاندانی بادشاہتیں قائم کر لیں۔ وہ مسلمانوں کی ملوکیت تو تھی مگر اسلامی شورائیت نہ تھی۔ اسلام کی انقلابی سیاسی جمہوری روح دفن کر دی گئی۔ بادشاہوں نے نعرہ لگایا کہ وہ خدا کا سایہ (ظل اللہ) ہیں۔ بہت سارے علماء نے اس غیر اسلامی نظریے کی تائید کی۔ پوری سیاسی تاریخ میں اکثر علماء کی کتب میں یہ بحث درج ہے کہ امیر کی اطاعت لازم ہے۔ شوریٰ صرف مشورہ دے سکتی ہے۔

اس کا کیا انجام ہوا۔ اس کی دو مثالیں دیکھیں۔ دین الٰہی[2] کے بنانے والوں میں اپنے عہد کے سب سے جید علماء ملا مبارک، ملا ابوالفضل اور فیضی شامل تھے۔ اس عہد کے 450 علماء نے ایک محضر نامہ لکھا کہ شہنشاہ اکبر[3] (d. 1605) کو دین کی تعبیر کا حق حاصل ہے اور اس کی اطاعت

۱۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں کہیں سے بہت سے کپڑے آئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے وہ کپڑے لوگوں میں تقسیم کر دیئے۔ ہر آدمی کو ایک ایک کپڑا ملا۔ پھر ایک دن آپ رضی اللہ عنہ منبر پر جلوہ افروز ہوئے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے بدن پر کپڑوں کا جوڑا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لوگو! میری بات سنو۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نہ آپ رضی اللہ عنہ کی بات سنتے ہیں اور نہ ہی مانتے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے متعجب ہو کر کہا کہ اے ابوعبداللہ! کیوں؟ انہوں نے کہا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے ہم میں تو ایک ایک کپڑا تقسیم کیا اور اپنی ذات کے لیے دو کپڑے رکھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے ابوعبداللہ! جلدی نہ کرو۔ پھر آواز دی۔ اے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے امیر المومنین میں حاضر ہوں۔ فرمایئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تجھے خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ جو کپڑا میں نے پہنا ہوا ہے، کیا یہ تیرا کپڑا ہے؟ انہوں نے کہا کہ جی ہاں، یہ میرا ہے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں، اب ہم آپ رضی اللہ عنہ کی بات سنیں گے اور اطاعت بھی کریں گے۔ بحوالہ تاریخ طبری از امام طبریؒ۔ جلد پنجم: صفحہ نمبر 24

۲۔ مغل بادشاہ، اکبر نے اپنے دور میں، ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔ جس کا نام دین الٰہی تھا۔ اکبر کے مطابق، دین اسلام، ہندو مت، مسیحیت، سکھ مذہب، اور زرتشت مذاہب کے، عمدہ اور خالص اُصولوں کو اکھٹا کر کے ایک نیا دینی تصور قائم کرنا تھا۔

۳۔ ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر (1542ء-1605ء) ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا تیسرا بادشاہ تھا جو 1556ء سے لے کر 1605ء تک برسر اقتدار رہا۔

واجب ہے۔ اس کا انجام دین الٰہی کی شکل میں سامنے آیا۔ جب مجدد الف ثانیؒ[1] اور پھر اورنگ زیبؒ[2] نے دین الٰہی کی مخالفت کی تو اکثر صوفیا اور علما نے مجددی تحریک کے خلاف مغل بادشاہوں کا ساتھ دیا۔ اورنگ زیبؒ کی بجائے داراشکوہ[3] کا ساتھ دیا۔

یہ تو تھیں علمی باتیں۔ عملی طور پر ملوکیت نے سیاسی جبر (political opposition) پیدا کیا۔ ہندوستان کے ایک مسلمان حاکم نے کسی شہری سے ناراض ہو کر اسے ہاتھی کے پاؤں تلے روندنے کا حکم دیا۔ شام کو جب بادشاہ سلامت مغرب کی نماز پڑھنے لگے تو امام صاحب نے اتفاقاً سورۃ الفیل (جس میں ہاتھی والوں کی بربادی کا ذکر ہے) کی تلاوت کی۔ بادشاہ سلامت برہم ہو گئے کہ امام اس کی تضحیک (insult) کر رہا ہے۔ بادشاہ سلامت نے حکم دیا کہ اس امام کو بھی ہاتھی کے پاؤں تلے روند دیا جائے۔ حضرت اقبالؒ فرماتے ہیں:

کرتی ہے ملوکیّت آثارِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز[4]

---

[1] ۔ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (1564ء-1624ء) ہندوستان کے مشہور و معروف عالم اور صوفی بزرگ تھے جنہوں نے بادشاہ اکبر کے دین الٰہی اور دیگر خلاف شرع بدعات کے خلاف بھرپور عملی کوششیں کیں۔

[2] ۔ سلطان اورنگزیب عالمگیرؒ (1618ء-1707ء) مغلیہ سلطنت کا بادشاہ اور شاہ جہاں کا بیٹا تھا۔ جس نے 1658ء سے لے کر 1707ء تک ہندوستان پر حکومت کی۔ عالمگیرؒ نے ہندوستان میں حکومتی سطح پر اسلامی شریعت کا احیا کیا جس کی وجہ سے آپؒ کو محی الدین کا خطاب دیا گیا۔ فتاویٰ عالمگیری آپؒ کے دور کی شاہکار تخلیق ہے۔ مغل بادشاہوں میں عالمگیرؒ واحد حافظ قرآن بادشاہ تھا۔

[3] ۔ داراشکوہ (1615ء-1659ء) مغل شہنشاہ شاہجہان کا بیٹا اور اورنگزیب کا بھائی تھا۔

[4] ۔ غزلیں: بال جبریل از محمد اقبالؒ

(ii) غلامی

سیاسی نظریئے میں اسلام نے اس عہد کی انسانی غلامی کی تمام شکلوں کی مخالفت کی اور انسان کو آزادی کا درس دیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ تاریخی فقرہ یاد کریں کہ

ماؤں نے انسانوں کو آزاد جنا ہے۔ تم ان کو کیوں غلام بناتے ہو[1]۔

یہ آزادی کا اعلام عہد حاضر کے مشہور فرانسیسی فلسفی اور سیاسی مفکر روسو[2] (Rousseau, d. 1778) کے اس مشہور نعرہ سے بھی زیادہ جامع (comprehensive) ہے کہ

انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر ہر جگہ غلامی کی زنجیروں میں ہے۔

روسو تو ہزار سال بعد ایک حقیقت کا اظہار کر رہا ہے مگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ انسانی آزادی کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ یہ صرف جسمانی غلامی کے خلاف جہاد نہیں تھا بلکہ غلامی کی تمام شکلوں کے خلاف بغاوت تھی۔ جس کا اظہار ایران کے شہنشاہ کے دربار میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے قاصد نے بہت خوبصورت پیرائے میں کیا:

---

[1]۔ کنز العمال۔ جلد ششم: رقم: 5640 (مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے نے ایک عام مصری شہری کو ایک بار کوڑا مارا اور کہا کہ وہ گورنر کا بیٹا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ مصری اس گورنر زادے سے بدلہ لے اور لڑکے کے باپ (حضرت عمر بن العاص رضی اللہ عنہ) سے کہا کہ تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا ہے حالانکہ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے ہیں۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا امیر المومنین رضی اللہ عنہ مجھے اس واقعہ کا علم نہ تھا اور نہ ہی یہ مصری میرے پاس شکایت لے کر آیا تھا)

[2]۔ Jean-jacques Rousseau؛ ژاں ژاک روسو (1712ء-1778ء) انسانی مساوات کا مبلغ اور ایک فلسفی تھا۔ جس کی تحریریں فرانس میں انقلاب برپا کرنے کا سبب بنیں۔

ہم انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی غلامی میں ڈالنا چاہتے ہیں[1]۔

اس لیے کہ اللہ پاک کی غلامی انسان کو باقی تمام غلامیوں سے نجات دے دیتی ہے۔ حضرت اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات[2]

غلامی کا عمل ہمہ گیر (global) اثرات کا حامل ہے اور شرف انسانی (human dignity) کے خلاف ہے۔ انسانی دائرہ عمل سکڑ کر رہ جاتا ہے۔ آزادی میں انسان اپنی ذات کا بھرپور اظہار کر سکتا ہے۔ تخلیقی عمل (creative action) کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ حضرت اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب

اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی[3]

ہمارے بادشاہوں کو یہ انسانی شرف پسند نہ آیا۔ انھوں نے انسانوں کو جسمانی اور ذہنی طور پر غلام بنانا شروع کر دیا۔ غلاموں کی خرید و فروخت ہونے لگی۔ حرم میں باندیوں (slave girls) کا

۱۔ تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) از امام ابی جعفر محمد بن جریر طبریؒ۔ جلد دوم۔ صفحہ نمبر 702

۲۔ نماز؛ ضرب کلیم از محمد اقبالؒ

۳۔ خضرِ راہ؛ بانگ درا از محمد اقبالؒ

ہجوم بڑھنے لگا۔علما نے قرآن وحدیث کی تعلیمات کے خلاف فقہ کی کتابوں میں غلاموں اور باندیوں کے مسائل اور جواز کے دلائل دیئے۔اسلام کی حریت کی تعلیم اور شرف انسانی کی تعظیم کو پس پشت ڈال دیا گیا۔جس نے بھی ذرہ بھر آواز بلند کی اس کو قید وسلاسل میں ڈال دیا گیا۔شہید کر دیا گیا۔حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ، محمد نفس ذکیہؒ [۱]، احمد بن حنبلؒ [۲]، امام ابو حنیفہؒ [۳]، مجدد الف ثانیؒ اور اما سرخسیؒ [۴] کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

۱۔محمد النفس الزکیہ یہؒ بن عبداللہ کامل بن حسن المثنیٰ بن حسن السبط بن علی ابن ابی طالب (763ء وفات) فاطمی سادات میں سے تھے۔آپؒ کا اصل نام محمد تھا لیکن اپنے زہد وتقویٰ کی وجہ سے نفس الزکیہ مشہور تھے۔ آپؒ کو عباسی اپنی حکومت کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔اسی لیے انہوں نے انہیں شہید کروا دیا۔

۲۔حضرت امام احمد بن حنبلؒ (780ء-855ء) اپنے دور کے بڑے عالم اور فقیہ تھے۔آپؒ امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں۔اپنے زمانہ کے مشہور علمائے حدیث میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔انہوں نے (مسند) کے نام سے حدیث کی کتاب تالیف کی جس میں تقریباً چالیس ہزار احادیث ہیں۔

۳۔امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ (702ء-772ء) مسلمان عالم دین، مجتہد، فقیہ اور اسلامی قانون کے اولین تدوین کرنے والوں میں شامل تھے۔ان کی وجہ شہرت احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اکٹھا کرنے اور فقہی اجتہاد کی وجہ سے ہے۔جو لوگ ان کی تشریحات پر عمل کرتے ہیں حنفی کہلاتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اس طرح فقہ حنفی کے بانی امام سمجھے جاتے ہیں۔

۴۔شمس ائمہ محمد بن احمد ابوبکر امام سرخسیؒ (متوفی 438ہجری) ایک مشہور ومعروف حنفی سکالر تھے جن کا تعلق ایران کے شہر سرخس سے تھا۔اسی شہر کی نسبت سے سرخسی مشہور ہو گئے۔آپؒ کی مشہور کتاب المبسوط فی الفقہ ہے۔

(iii) ظلم

اسلام نے ظلم کے معاشرے کے خلاف عدل کا اعلان کیا ہے۔ افلاطون[1] (Plato, d. 347 BC)
نے ایک نظری بحث کے طور کہا کہ
انصاف نیکی ہے اور نیکی انصاف ہے۔
قرآن پاک نے اس سے بڑھ کر بات کی کہ

لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ [2]

(دنیا میں تمام انبیاء اور تمام آسمانی کتابیں اس لیے نازل کی گئی ہیں کہ لوگوں کے درمیان انصاف قائم کیا جاسکے)

انبیاء کرام علیہم السلام اور تورات، زبور، انجیل اور قرآن پاک کی بعثت کا مقصد نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ قائم کرنا نہیں ہے بلکہ انصاف قائم کرنا ہے۔ اس سے بہتر عدل کی تبلیغ کیسے ممکن ہے؟
بعض علماء نے تو یہاں تک کہا ہے کہ کافروں کی عادلانہ حکومت مسلمانوں کی ظالمانہ حکومت سے بہتر ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مشہور قول ہے:

---

[1]۔ Plato؛ افلاطون (347BC - 428BC) یونان کے موثر ترین فلسفیوں میں سے ایک ہے۔ افلاطون سقراط کا شاگرد اور متعدد فلسفیانہ مکالمات کا خالق اور ایتھنز میں اکادمی (اکیڈمی) نامی ادارے کا بانی تھا۔ جس میں بعد ازاں ارسطو نے تعلیم حاصل کی۔ افلاطون نے اکیڈمی میں وسیع پیمانے پر تعلیم دی اور بہت سے فلسفیانہ موضوعات، جن میں سیاست، اخلاقیات، مابعد الطبیعیات اور علمیات شامل ہیں، پر لکھا۔ افلاطون کے مکالمات (Dialogues) اس کی اہم ترین تحریریں ہیں۔

[2]۔ سورۃ الحدید: آیت: 25

الملك یبقیٰ مع الکفر ولا یبقیٰ مع الظلم

(حکومت کفر کے ساتھ چل سکتی ہے ظلم کے ساتھ نہیں چل سکتی)

مسلمانوں نے عدل کی بہت جامع تعریف کی۔ظلم کو بہت جہتوں (dimensions) سے دیکھا۔ کسی بھی چیز کو اس کی اصل جگہ پر رکھنے کو عدل کہا اور کسی بھی چیز کو غلط جگہ پر رکھنے کو ظلم قرار دیا۔ عدل وظلم کی اسی تعریف نے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے احاطہ میں لے لیا۔مسلم معاشرہ عدل کی بنیادوں پر قائم ہوا جہاں سماجی عدل (social justice) بھی تھا۔سیاسی عدل بھی تھا اور معاشی عدل بھی تھا۔استحصال (exploitation) کی تمام شکلیں حرام قرار پائیں۔حقوق وفرائض میں،فرد و معاشرے میں، ریاست اور شہریوں میں عدل قائم ہوگیا۔

پھر آہستہ آہستہ شیطانی و نفسانی فکر غالب آنا شروع ہوگئی۔ سیاسی و سماجی استحصال شروع ہوا۔ معاشی ظلم شروع ہوا۔ یہاں تک کہ بادشاہوں نے اپنے ظلم کے جواز کے لیے علماء کی خدمات حاصل کیں۔ روشنی کے چند میناروں کے سواء اکثر علما نے پوری تاریخ میں ظلم پر نہ صرف عملاً خاموشی اختیار کی بلکہ اس کی مختلف شکلوں کے مختلف جواب اور جواز (justifications) ڈھونڈے۔اس کی ایک مثال فقہ کی کتابوں میں زکوٰۃ سے بچنے کے طریقے ہیں۔آپ کو فقہ کی بعض کتب میں حیلہ کا باب ملتا ہے جہاں بنی اسرائیل کے حیلے بھی حقیر معلوم ہوتے ہیں۔پھر یہ ہوا کہ ہم عدل کو بھول گئے اور ظلم کو اس کی تمام شکلوں میں قبول کرلیا۔

(iv) تذلیل انسانی

اسلام نے شہریوں کے حقوق کی بات کی۔ اعلان کیا کہ انسانی حقوق اس لیے ہیں کہ

انسان اشرف المخلوقات (best creation) ہے۔ یہ سیاسی وسماجی حقوق اس لیے نہیں کہ بادشاہ نے عنایت (award) کیے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاریخ انسانی میں پہلی بار نہایت ہی وضاحت کے ساتھ حجۃ الوداع (last pilgrimage) میں انسانی حقوق کا چارٹر دیا۔ جس کے بارے میں پورے علمی یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عہد حاضر کی انسانی حقوق کی تحریک کی ابتداء وہاں سے ہوئی۔ یہ تحریک اسی خطبے سے روشنی لے رہی ہے یا ابھی اس کی تلاش میں ہے۔ اسلام نے حقوق کی حفاظت ریاست کے سپرد کی اور تصور حقوق کو بہت وسعت عطا کی۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہریوں کے تعلیمی حق کا کتنا خیال تھا کہ عام طور پر جنگی قیدیوں سے فرماتے تھے کہ ہمارے لوگوں کو تعلیم دے دو۔ تم آزاد ہو جاؤ گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی یہ نہیں کہ کہ یہ یہودی اور عیسائی قیدی مسلمانوں کا ایمان خراب کر دیں گے۔

معاشی حقوق کا جائزہ لیں۔ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو بلایا کہ آپ رضی اللہ عنہ معاشی انصاف پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے پاس ایک بکری ہے۔ اس کا آدھا دودھ میرا ہے اور آدھا ہمسایوں کا اور یہ **قُلِ الْعَفْوَ**[1] ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کی دلیل کیا ہے؟ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کیسا خوبصورت جواب دیا:

اوصانی خلیلی (میرے دوست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی حکم ہے)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مرا تو اس کا

---

[1] سورۃ البقرہ: آیت: 219، وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ (تم سے یہ بھی دریافت کرتے ہیں کیا کچھ خرچ کریں؟ تو آپ فرما دیں اپنی ضرورت سے زائد چیز خرچ کرو)

حساب مجھ سے لیا جائے گا۔ یہ ایک نعرہ نہیں تھا۔ ان کے الیکشن کا منشور (manifesto) نہیں تھا بلکہ اسلامی فکر اور سیاسی پالیسی کا اعلان تھا۔

دل چاہتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک نہایت ہی مختصر اور نہایت ہی خوبصورت حدیث سناؤں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

انا ولی من لا ولی له

(میں اس کا ذمہ دار ہوں جس کا کوئی مددگار نہیں)

یہ محض ایک اخلاقی نصیحت نہیں بلکہ ہر مسلمان کو اس کی ذمہ داری بتائی جا رہی ہے کہ مسلمان معاشرے کے تمام کمزور طبقات (غریب، بیوہ، یتیم، خواتین وغیرہ) کے ذمہ دار ہیں۔ یہ وہ تعلیمات تھیں جنہوں نے ایک خوبصورت معاشرہ قائم کیا جہاں انسان کی عزت تھی۔

2۔ علمی چیلنج

آیئے ہم دیکھیں کہ مسلمانوں نے اپنے ابتدائی زمانے میں اس عہد کے علمی چیلنجوں کا کیسے مقابلہ کیا؟

اسلام کے مطابق انسانیت کی ابتداء علم سے ہوئی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا

عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○ قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْۤ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ[1]

(جب اللہ پاک نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کیا کہ کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خون ریزیاں کرے گا۔ آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ فرمایا: میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔ اس کے بعد اللہ عزوجل نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔ پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تمہارا خیال صحیح ہے تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ! انہوں نے عرض کیا: نقص سے پاک تو صرف آپ کی ذات ہے۔ ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم سے کہا کہ تم انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ جب اس نے ان کو ان سب کے نام بتا دیئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے چھپی ہوئی ہیں)

آپ ملاحظہ فرمائیں۔ فرشتوں کی تقدیس وعبادت کے مقابلے میں انسانی علم کو لایا جارہا ہے۔ علم دے کر آدم علیہ السلام کو فرشتوں سے فضیلت دی گئی۔ علم کو عبادت سے افضل قرار دیا جارہا ہے۔ شرف آدم علیہ السلام قرار دیا جارہا ہے۔ علم ہی اللہ تعالیٰ کا نائب بننے کے لیے لازم ہے۔ علم بھی اشیا کا دیا جارہا ہے جو سائنس کا موضوع ہے۔

---

[1]۔ سورۃ البقرہ: آیت: 30-33

اسلام کی ابتداء علم سے ہوئی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلی وحی یہ نازل ہوئی:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۞ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۞ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۞ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۞ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ [1]

(پڑھو! (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو! اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا)

آپ دیکھ لیں کہ نبوت کی ابتدا سائنسی علوم کی طرف مائل کرنے سے ہو رہی ہے۔ خدا کی معرفت کے لیے علم حیاتیات (biology) کی دلیل لائی جا رہی ہے۔ پھر قلم کی عظمت بیان ہو رہی ہے۔ کائنات کی عام تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور پر انسان کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس کمزور حالت سے اس کی تخلیق کی ابتداء کر کے اسے پورا انسان بنایا۔ یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے انسان کو صاحب علم بنایا جو مخلوقات کی بلند ترین صفت (virtue) ہے اور صرف صاحب علم ہی نہیں بنایا بلکہ اس کو قلم سے لکھنے کا فن سکھایا جو بڑے پیمانے پر علم کی اشاعت و ترقی کا ذریعہ بنا۔ اگر وہ الہامی طور (intuitively) پر انسان کو لکھنے کا فن نہ دیتا تو انسان کی ترقی رک جاتی اور علم اگلی نسلوں تک منتقل نہ ہوتا۔

فلسفہ مسلمانوں کا علم نہیں ہے۔ اسلام کی بعثت سے پہلے معلوم انسانی تاریخ کے عظیم ترین فلسفی

۱۔ سورۃ العلق: آیت: 1-5

یونان میں پیدا ہو چکے تھے۔ دنیا میں افلاطونی مثالیت (Platonic idialism) ارسطو[1] کی منطق (Aristotlian logic) وغیرہ کا غلبہ تھا۔ مسلمانوں نے فلسفہ کو کفر قرار نہ دیا بلکہ اس کی تعلیم حاصل کی۔ ابو نصر محمد بن محمد فارابی[2] (Abu Nasr Muhammad ibn Muhammad Al Farabi, d. 950) پہلا مسلمان عالم تھا جو یونان کے فلسفہ کا شارع بنا اور تاریخ فلسفہ میں ارسطو (Aristotle, d. 322BC) کو معلم اول (first teacher) اور فارابی کو معلم ثانی (second teacher) کہا جاتا ہے۔

ہمارے علما نے فلسفہ یونان کو سمجھا۔ اس کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تا کہ مسلم دنیا میں پڑھا جا سکے اور پھر اس پر عالمانہ تنقید کی۔ امام غزالیؒ[3] (Abu Hamid Muhammad ibn Muhammad al-Ghazali, d. 1111) نے تہافتہ الفلاسفہ (فلسفیوں کی تباہی) لکھی۔ اس میں انہوں نے

۱۔ ارسطو یونان کا ممتاز فلسفی، مفکر اور ماہر منطق تھا، جس نے سقراط اور افلاطون جیسے اساتذہ کی صحبت پائی اور سکندر اعظم جیسے شاگرد سے دنیا کو متعارف کروایا۔

۲۔ ابو نصر محمد الفارابی (872ء-950ء) ایک مشہور ریاضی دان، طبیب، فلسفی، سائنسدان، علم نجوم کا ماہر اور موسیقار تھا۔ اس کو ارسطو کے بعد دوسرا بڑا فلسفی بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے علم طبیعیات میں وجود خلاء پر اہم تحقیقات کیں۔ اس کے علاوہ ماہر عمرانیات، سیاسیات و موسیقیات بھی تھا۔ فارابی ارسطو اور افلاطون سے بے حد متاثر تھا۔ اس نے ارسطو کی اکثر کتابوں کی شروحات لکھیں، اسی وجہ سے اسے ''معلّم ثانی'' بھی کہا جاتا ہے۔ ان شرحوں میں شرح 'ایساغوجی' اور بطلیموس کی 'المجسطی' بہت مشہور ہیں۔

۳۔ ابو الحامد محمد بن محمد الغزالیؒ (1058ء-1111ء) اسلام کے نہایت مشہور مفکر، صوفی اور متکلم تھے۔ آپؒ کی کتابوں میں احیاء العلوم الدین ایک بلند پایہ تصنیف ہے جو کہ ہر دور میں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی رہی ہے۔ آپؒ کا شمار مجددین امت میں ہوتا ہے۔ آپؒ نے اسلامی شریعت و تصوف کو غیر ضروری فلسفہ سے پاک کیا۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپؒ نے فلسفہ کو دین بننے سے روکا۔

یونان کے فلسفہ پر سخت تنقید کی جس کا جواب یونان کے بجائے مسلم دنیا کے نامور فلسفی ابن رشد[1] (Averroes, d. 1198) نے دیا۔ ان کی کتاب کا نام تہافتہ التہافہ (تباہی کی تباہی) ہے۔ اس کے بعد امام ابن تیمیہؒ[2] (Taqi ad-Din Ahmad ibn Taymiyya, d. 1328) نے فلسفہ یونانی پر کاری ضرب لگائی۔ اس شرح اور تنقید کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں نے فلسفہ یونان کو پڑھا۔ اسے آگے منتقل کیا لیکن اس سے مرعوب نہ ہوئے۔

یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے یونان کے اس بے بہا علم کو مغرب تک پہنچایا۔ جرمن فلسفی کانٹ[3] (Kant, d. 1804) کی کتاب (Critique of Pure Reason) امام غزالیؒ (al-Ghazali, d. 1111) کے فلسفے کی شرح لگتی ہے۔ یہی حال مسلمانوں نے ارسطو (Aristotle, d. 322BC) کی منطق کے ساتھ کیا۔ مثالیت (Idealism) نے بھی عرب تجربیت (Empiricism) سے اثر قبول کیا۔ پھر کیا ہوا کہ مسلمان سو گئے اور پرانی کتب ہی مدارس میں پڑھاتے رہے جبکہ زمانہ وسطیٰ (middle period) کے بعد نئے فلسفے متعارف

---

[1] Averroes؛ ابوالولید محمد ابن احمد ابن رشد (1126ء-1198ء) ایک ماہر فلسفی، ریاضی دان، ماہر علم فلکیات، ماہر فن طب اور قانون دان تھا۔ ابن طفیل اور ابن اظہر جیسے مشہور عالموں سے دینیات، فلسفہ، قانون، علم الحساب اور علم فلکیات کی تعلیم حاصل کی۔ خلیفہ یعقوب یوسف کے عہد میں اشبیلیہ اور قرطبہ کا قاضی رہا۔

[2] تقی الدین احمد ابن تیمیہؒ (1263ء-1328ء) اسلامی سکالر اور مفکر تھا۔ جس نے اپنی زندگی میں قلم اور تلوار دونوں سے جہاد کیا۔ انہوں نے تاتاریوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کی سرپرستی کی۔

[3] Immanuel Kant؛ ایمانویل کانت (1724ء-1804ء) ایک جرمن فلسفی اور مشہور ترین مفکر تھا۔ کانٹ نے فلسفے کی دنیا میں انقلاب پیدا کیا۔ وقت کی حاکم قوتوں کے بارے میں سوال پیدا کیے۔ عقل اور آزادی کو اپنی سوچ کا محور قرار دیا۔ اسکے خیالات اب بھی مستقبل کے لیے مشعل راہ ہیں۔

ہوئے جن کا ہم نے مطالعہ وتدارک نہ کیا۔

مسلمان تخیلاتی (speculative) نہیں بلکہ عملی (practical) تھے۔قران پاک نے انسان کو تجربیت ومشاہدہ (observation) سکھایا۔قرآن پاک نے بار بار کہا: کیاتم آسمان نہیں دیکھتے؟ کیاتم زمین نہیں دیکھتے؟ کیاتم جانور نہیں دیکھتے؟ یہ وہ تعلیمات تھیں جنہوں نے مسلمانوں کو عملی سائنس کی طرف مائل کیا۔طبیعات میں ہم نے روشنی (light) کا مطالعہ کیا۔ ابوالہیثم[1] (ibn al-Haytham, d. 1040) نے جدید فزکس کی بنیاد رکھی۔ الخوارزمی[2] (al-Khwarizmi, d. 850) نے نویں صدی عیسوی میں دنیا کو جدید ریاضی کا علم دیا۔

---

[1]۔ابوعلی الحسن بن الہیثم، ابن الہیثم کے نام سے مشہور ہیں۔ابن الہیثم (965ء-1039ء) عراق کے تاریخی شہر بصرہ میں پیدا ہوئے۔ وہ طبعیات، ریاضی، انجنئرنگ، فلکیات اور علم الادویات کے مایہ ناز محقق تھے۔ان کی وجہ شہرت آنکھوں اور روشنی کے متعلق تحقیقات ہیں۔

[2]۔عبداللہ بن محمد بن موسیٰ خوارزمی (780ء-850ء) خوارزم سے تعلق رکھتے تھے۔آپ ریاضی اور فلکیات کے ماہر تھے۔ مشہورِ زمانہ کتاب الجبر والمقابلہ جسے انہوں نے لوگوں کے روزمرہ ضروریات اور معاملات کے حل کے لیے تصنیف کیا جیسے میراث، وصیت، تقسیم، تجارت، خرید وفروخت، کرنسی کا تبادلہ (ایکسچینج)، کرایہ، عملی طور پر زمین کا قیاس (ناپ)، دائرہ اور دائرہ کے قطر کا قیاس، بعض دیگر اجسام کا حساب جیسے ثلاثی، رباعی اور مخروط ہرم وغیرہ۔ آپ کا ایک کارنامہ صورت الارض نامی کتاب کی تصنیف بھی ہے جس میں مختلف قدرتی اور آدم ساز (انسانوں کے بنائے ہوئے) خطے مثلاً پہاڑوں سمندروں، جزیروں، دریاؤں، نہروں اور شہروں کو ان کے ناموں کی ترتیب کے اعتبار سے ارضیاتی نقشہ جات میں وقت اور تصحیح کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ خوارزمی پہلے سائنسدان تھے جنہوں نے علم حساب اور علم جبرا کو الگ الگ کیا۔ جبرا کو علمی اور منطقی انداز میں پیش کیا۔خوارزمی نہ صرف عرب کے نمایاں سائنسدانوں میں شامل ہیں بلکہ دنیا میں سائنس کا ایک اہم نام ہیں۔انہوں نے نہ صرف جدید جبر کی بنیاد رکھی بلکہ علم فلکیات میں بھی اہم دریافتیں کیں۔ ان کا زیچ علم فلک کے طالبین کے لیے ایک طویل عرصہ تک ریفرنس رہا۔ الخوارزم (لاطینی میں جو ''الگورتھم'' بنا) آپ ہی کے نام سے ماخوذ ہے۔

ابن سینا[1] (Avicenna, d. 1037) وزہراوی[2] (al-Zahrawi, d. 1013) نے جدید طب (میڈیسن) اور جراحت (سرجری) کی بنیاد رکھی۔ تفصیل میں جائے بغیر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ مسلمان سائنسدانوں نے دنیا کو جدید سائنس دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تسخیر کائنات اور تسخیر ذات میں فرق نہ کرتے تھے۔ ان کے ہاں اس دنیا اور اس دنیا کی تفریق نہ تھی۔ وہ مادہ اور روح کی تقسیم کے قائل نہ تھے۔ وہ قدیم (old) وجدید (new) علم کی بحث کو بے خبری سمجھتے تھے۔ سائنسی علوم کی تحصیل سے مسلمان ٹیکنالوجی میں ماہر تھے۔ فرانس کے عظیم بادشاہ شارلیمان[3] (Charlemagne, d. 814) کو گھڑی عباسی خلیفہ ہارون الرشیدؒ[4] (Harun al-Rashid,

---

[1]۔ ابن سینا (980ء-1037ء) کا مکمل نام علی الحسین بن عبداللہ بن الحسن بن علی بن سینا ہے، جو دنیائے اسلام کے ممتاز طبیب اور فلسفی ہیں۔ ابن سینا کو مغرب میں Avicenna کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کا لقب ''الشیخ الرئیس'' ہے۔ اسلام کے عظیم تر مفکرین میں سے تھے اور مشرق کے مشہور ترین فلسفیوں اور اطباء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

[2]۔ ابوالقاسم خلف بن عباس الزہراوی (936ء-1013ء) اندلس سے تعلق رکھنے والے علم جراحت کے بانی، متعدد آلات جراحی کے موجد اور مشہور مسلم سائنسدان تھے۔ آپ کی مشہور کتاب التصریف لمن عجز عن التالیف ہے جو کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ الزہراوی صرف ماہر جراح ہی نہیں تھے بلکہ تجربہ کار طبیب بھی تھے، ان کی کتاب میں آنکھوں کے امراض، کان، حلق، دانت، مسوڑھے، زبان، عورتوں کے امراض، فنِ تولید، جبڑہ اور ہڈیوں کے ٹوٹنے پر تفصیلی ابواب موجود ہیں۔ الزہراوی نے ناسور کے علاج کے لیے ایک آلہ دریافت کیا اور بہت سارے امراض کا استری سے علاج کیا۔ زہراوی وہ پہلے طبیب تھے جنھوں نے ہیموفیلیا نہ صرف دریافت کیا بلکہ اس کی تفصیل بھی لکھی۔ آپ کے ایجاد کردہ آلات جراحی آج تک استعمال ہوتے ہیں۔

[3]۔ Charlemagne؛ شارلیمان (742ء-814ء) فرانس اور روم کا بادشاہ تھا۔

[4]۔ ہارون الرشید (763ء-809ء) پانچویں اور مشہور ترین عباسی خلیفہ تھے۔ وہ 786ء سے 24 مارچ 809ء تک مسند خلافت پر فائز رہے۔ ان کا دور سائنسی، ثقافتی اور مذہبی رواداری کا دور کہلاتا ہے۔ ان کے دور حکومت میں فن وحرفت اور موسیقی نے بھی عروج حاصل کیا۔

(d. 809) نے بھجوائی تھی۔

پھر کیا ہوا؟ ہمیں نیند آ گئی۔ ہم روایت میں الجھ گئے۔ خرافات میں کھو گئے۔ ہم نے دنیا و دین میں تفریق کر ڈالی۔ ہم نے دنیاوی ترقی کو طلب دنیا سے تعبیر کیا۔ اصل ٹھوس مادی علوم کو چھوڑ کر لذت سکر میں گم ہو گئے۔ علمی موشگافیوں اور علم الکلام (scholasticism) کی غیر ضروری بحثوں میں الجھ کر رہ گئے اور زمانہ حسب عادت ہمیں پیچھے چھوڑ کر چلا گیا[1]۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے باب: 3 انسانی تہذیب پر اسلام کے اثرات

۳

انسانی تہذیب پر اسلام کے اثرات

1۔ اخلاقی اثرات

(i) خدائی شعور

اسلامی انقلاب نے انسانی نفسیات اور سماجیات پر بہت گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ اسلام سے پہلے مذہب وفلسفے کا عمومی انسانی زندگی پر کوئی بہت زیادہ گہرا اثر نہ تھا۔ اخلاق ومعاشرت عمومی طور پر مذہبیت سے زیادہ متاثر نہیں تھے۔ خدا کائنات کی تعمیر کے بعد الگ تھلگ تھا۔ لوگوں کے دل خدا کے خوف سے عاری تھے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت سے دور تھے۔ خدا کے خوف اور محبت کو ایک عملی اور تخلیقی قوت کے طور پر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ یونانی فلسفہ بھی زیادہ تر ذات باری تعالیٰ کی صفات کے بارے میں منفی رائے رکھتا تھا۔ وہ اللہ عزوجل کی بے پایاں رحمت، محبت و بخشش کے تذکروں سے نامانوس تھا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ منفی جذبوں پر کوئی مثبت وجاندار تمدن قائم نہیں ہوسکتا۔

مسلمانوں نے اس بے جان اور بیمار معرفت سے انسانیت کو نجات دلائی۔ اللہ عزوجل کا وہ تصور دیا جو کہ روح وجان دونوں پر حاوی تھا۔ زندگی کی رگ رگ میں اترنے والا تھا۔ مسلمان کا رب رحمٰن تھا۔ رحیم تھا۔ پیار کرنے ولا تھا۔ رازق تھا۔ اونچی شان والا تھا۔ کرم کرنے والا تھا۔ امن دینے والا تھا۔ نگہبان تھا۔ عظمت والا تھا۔ ساتھ ہمیں بھی حکم تھا کہ اللہ کی ان صفات کو اپنے اندر جذب کرنا ہے۔ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگنا ہے کہ یہی سب سے بہتر رنگ ہے۔

اس سوچ نے کہ وہ مالک ہے۔ نظام چلا رہا ہے۔ جزا وسزا دیتا ہے۔ ایک شعوری زندگی کا تصور دیا۔ جس میں خدا ایک زندہ حقیقت تھی۔ ایمان رگ و پے میں دوڑنے لگا۔ دماغ و دل اس سے منور ہونے لگے۔ ایک پاک صاف اور اجلی شخصیت سامنے آنے لگی۔ جو اللہ تعالیٰ کے وجود کے احساس میں ڈوبی ہوتی تھی۔ جو محبت میں سرشار تھی۔

(ii) اخلاقی جرات

اس روحانی فکر نے ایک اعلیٰ قوت ارادی عطا کی۔ ذاتی احتساب کی سوچ عطا کی جو لغزشوں کی اصلاح کے لیے پیہم (perpetual) عمل تھا۔ ہر لحہ روکنے والا نفس لوامہ[1] عطا کیا جو رات کی تنہائی میں بھی نافرمانی سے روکتا تھا۔ لوگ خود آکر کر کہتے کہ جناب ہم سے تنہائی میں یہ گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ مجھے سزا دیجئے۔ یہ احتساب نفس (self accountability) تھا۔ یہ ضمیر کی ملامت تھی۔ جس نے ہر مسلمان کے دل میں ڈیرے ڈال لیے۔ اس اعلیٰ فکر سے امانت و دیانت کے عاعلیٰ معیار بنے۔ پاکیزگی اور شرافت آئی جو جلوت (company) اور خلوت (solitude) میں یکساں موجود تھی۔ جس نے نفسانی ترغیبات (motivation) وخواہشات پر قابو پا لیا۔ انسان کے لیے غیر اللہ کے سامنے جھکنا مشکل ہو گیا۔ بادشاہ، عالم، جابر سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق نظر آنے لگے۔ اللہ عزوجل کی ذات عالی کی عظمت نے انسان کو اس تمام مخلوقات سے آزاد کر دیا۔ دنیا کا حسن و جمال، شان وشوکت، دربار کی عظمت، سب ہیچ ہو گئیں۔

۱۔ انسانی ضمیر جو انسان کو غلط کاموں پر ملامت کرتا ہے، نفس لوامہ کہلاتا ہے۔ نفس لوامہ امر ربی اور روح کا مظہر ہے۔

تاریخ نے یہ بھی دیکھا کہ عرب فقیر قیصر و کسریٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے لگے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے رستم ایران (ایران کا سپہ سالار) کے پاس حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ جب وہ رستم کے دربار میں پہنچے تو دربار سجا تھا۔ تاج و تخت تھا۔ ریشم و حریر تھا۔ یاقوت و مرجان تھے۔ یہ اللہ والا غربت کے ہاتھوں تنگ تھا۔ مختصر سا لباس تھا۔ نیم مردہ سا گھوڑا تھا۔ محل میں وہ گھوڑے سے نہیں اترے۔ مخمل و کمخواب (velvet) کے فرش پر چلتے گئے۔ حتیٰ کہ گھوڑے کو دربار کے گاؤ تکیہ سے باندھ دیا۔ نیزے کو فرش پر مارتے مارتے رستم تک پہنچے [1]۔ ارشاد فرمایا:

ہم کو اللہ پاک نے اس لیے بھیجا ہے کہ جس کے بارے میں اس کی مرضی ہو اس کو بندوں کی بندگی سے نجات دلا کر اللہ تعالیٰ کی بندگی میں داخل کریں۔ دنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں پہنچا دیں اور مذاہب کی زیادتیوں سے بچا کر اسلام کے عدل میں لے آئیں [2]۔

یہ اخلاقی عظمت تھی۔ یہ بے نیازی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی محبت و آخرت کی طلب نے عجب شجاعت بخش دی تھی۔ جنت کا شوق بھر دیا تھا۔ دنیا حقیر بنا دی تھی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے تھے۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی [3]

---

[1]۔ تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) از امام ابی جعفر محمد بن جریر طبریؒ۔ جلد دوم۔ صفحہ نمبر 701

[2]۔ تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) از امام ابی جعفر محمد بن جریر طبریؒ۔ جلد دوم۔ صفحہ نمبر 702

[3]۔ طارق کی دعا (اندلس کے میدان جنگ میں)؛ بال جبریل از محمد اقبالؒ

(iii) موت کی تمنا

غزوہ احد میں حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ شریک تھے۔ ایک موقع پر دشمن کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو سامنے دیکھا تو فرمانے لگے کہ

اے سعد (رضی اللہ عنہ)! خدا کی قسم جنت کی خوشبو احد پہاڑ کے اس طرف سے آرہی ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے اسی (80) سے زیادہ زخم ان کے جسم پر پائے۔ جسم ٹکڑے ٹکڑے تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی کوئی شناخت نہ کرسکا۔ ان کی بہن نے ان کی انگلی کے پور سے شناخت کیا[1]۔

غزوہ بدر میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بڑھو! اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین وآسمان ہے۔ تو حضرت عمر بن حمام انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اس کی وسعت زمین وآسمان ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں! کیا تم کو شک ہے؟ کہنے لگے نہیں۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میری تمنا تھی کہ میں اس کو پالیتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں! ہاں! آپ اس کو پالو گے۔ وہ چند دانے کھجور نکال کر کھانے لگے۔ پھر فرمانے لگے: اگر ان کھجوروں کے کھا لینے کا انتظار کروں گا تو بہت سا وقت لگے گا۔ پھر تمام کھجوروں کو پھینک دیا اور میدان میں کود پڑے اور شہادت پائی[2]۔

موت کے آئنے میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے[3]

---

[1] ۔صحیح بخاری۔جلد دوم: رقم:79

[2] ۔سنن کبری للبیہقی۔جلد نہم: رقم:4071

[3] ۔امامت؛ ضرب کلیم از محمد اقبالؒ

(iv) خودسپردگی

اس پاکیزہ فکر نے انسان کو مکمل سپردگی (resignation) عطا کی۔ اپنی ذاتی خواہشات سے دستبردار ہو کر وہ اللہ تعالیٰ کے غلام بن گئے۔ اپنی جان و مال کو اس کے سپرد کر دیا۔ جنگ اسی کے لیے، صلح اسی کے لیے۔ محبت اسی کے لیے۔ نفرت اسی کے لیے۔ ایمان کا ایک لمحہ ان کی کایا پلٹ دیتا تھا۔ اچھی چیز بری بن جاتی تھی۔ بری چیز اچھی بن جاتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے۔ فضالہ بن عمیر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کے ارادے سے آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فضالہ کیا کرنے آئے ہو؟ اس نے کہا کہ کچھ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبسم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا دست مبارک اس کے سینے پر رکھا۔ فضالہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ جیسے ہی سینے سے اٹھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ کو ایسے محبوب لگنے لگے کہ دنیا میں سب سے زیادہ محبوب۔ واپسی پر مجھے وہ عورت ملی جس سے دل لگی کرتا تھا۔ اس نے کہا کہ آؤ باتیں کریں۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اسلام کے بعد اب اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے[1]۔

(v) معرفت (Gnosis)

اللہ عزوجل کی ذات وصفات کے احساس، حیات کی ابتدا اور انتہا کے شعور اور حیات گزارنے کے ایک واضح عمل نے انسان کو ایک صحیح معرفت عطا کی۔ جس سے انسانی ذہن فلسفہ والہیات کی غیر ضروری جستجو سے بچ گیا۔ اس کی توانائیاں سلامت رہیں۔ ان صلاحیتوں کو مسلمانوں

---

[1]۔ زادالمعاد از حافظ ابن قیمؒ۔ جلد 2 صفحہ نمبر 232

نے دین و دنیا کے مفید کاموں میں صرف کیا اور دنیا کو ایک شاندار تمدن عطا کیا۔ جس کی بنیاد اعلیٰ اخلاقی اقدار اور مادی سہولت تھی۔

(vi) اجتماعی ذمہ داری

اسلامی فکر نے اجتماعی ذمہ داری (collective responsibility) کا تصور دیا۔ ظالم و مظلوم دونوں کی مدد کا حکم دیا۔ مظلوم کی مدد اس کی حمایت سے اور ظالم کی مدد اس کو ظلم سے روک کر[1]۔ ہر آدمی دوسرے کا ذمہ دار تھا۔ ہر ایک کے حقوق و فرائض تھے۔

(vii) محبت کا محور

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکل میں انسانیت کو حسن کا اعلیٰ نمونہ (paragon of beauty) مل گیا۔ جسے ابدی (eternal) محبت کا مرکز بنایا جا سکتا تھا۔ محبت ایک الوہی (divine) جذبہ ہے۔ جس کی حیرت انگیز قوت کے ہزاروں نمونے دنیا میں موجود ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی ایسا نقش نہیں ہے جس کی آبیاری (watering) محبت سے نہ ہوئی ہو۔ یہ حسین جذبہ دنیا کی چمک دمک میں مست تھا۔ انسانیت طویل عرصہ سے کسی ایسی شخصیت سے محروم تھی، جس کے در پر وہ اپنا دل و جان قربان کر سکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکل میں انسانیت کو ایک طاقتور، حسین ترین اور کامل ترین شخصیت میسر آ گئی جو انسانیت کا مرکز تھی۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دور سے دیکھتا مرعوب ہو جاتا۔ قریب سے دیکھتا تو فریفتہ ہو جاتا۔ دل چاہتا ہے کہ یہاں حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ کی ایک شاندار نعت کے اشعار درج کروں جو میری رائے میں حقیقت کے قریب تر ہیں:

---

[1] ۔ صحیح بخاری۔ جلد اول: رقم: 2341

بَلَغَ	العُلیٰ	بکمَالِہٖ
کَشَفَ	الدُجیٰ	بجمالِہٖ
حَسُنَت	جمِیع	خِصَالِہٖ
صَلُّوا	عَلیہِ	وآلِہٖ

(انسانی عظمت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں اپنے کمال تک پہنچی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسن وکمال کی روشنی سے اندھیرے چھٹ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تمام اعلیٰ انسانی خوبیاں تھیں۔ اللہ عزوجل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل پر سلام بھیجتے ہیں)

مرزا غالب نے بھی خوب کہا ہے:

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم است
آرے کلامِ حق بزبانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم است

(حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان میں ذات خداوندی جلوہ گر ہے)

(واقعی کلام حق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوتا ہے)

ایک انصاری عورت جس کا باپ، بھائی اور شوہر احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے اور شہید ہو گئے تھے۔ اسے خبر ملی تو وہ اپنے بیٹوں کی بجائے گھر سے نکل کر پوچھنے لگی: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے خیریت سے ہیں۔ اس نے کہا میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا چاہتی ہوں۔ اس نے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ لیا تو بولی: اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلامت ہیں تو دنیا کی ہر مصیبت ہیچ ہے[1]۔

۱۔ شرح حدیث مشکوٰۃ شریف۔ جلد اول: رقم:6

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو پھانسی کے تختہ پر چڑھایا گیا۔ سب کہنے لگے کہ کہو یہ پسند ہے کہ (نعوذ باللہ) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہاری جگہ ہوں؟ انہوں نے کہا کہ اللہ عزوجل کی قسم میں اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاؤں مبارک میں کانٹا بھی چبھے اور میں چھوڑ دیا جاؤں۔ وہ سب ہنس دیئے[1]۔

حضرت عروہ بن مسعود ثقفی (کفار مکہ کا سفیر) نے حدیبیہ سے واپسی کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہا: اے لوگو! خدا کی قسم، میں نے بہت سے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں۔ قیصر و کسریٰ کے دربار دیکھے ہیں۔ نجاشی[2] کا دربار بھی دیکھا ہے۔ خدا کی قسم! میں نے ایسا بادشاہ نہیں دیکھا جس کے ساتھ اس کی اتنی عزت کرتے ہیں جتنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔ خدا کی قسم جب وہ تھوکتے ہیں لوگ اس کو اپنے جسم پر مل لیتے ہیں۔ جب وہ ان کو حکم دیتے ہیں تو وہ سب ان کے حکم پر لپکتے ہیں۔ جب وہ وضو کرتے ہیں تو اس کے پانی پر لڑتے لڑتے رہ جاتے ہیں۔ جب بات کرتے ہیں تو لوگ اپنی آوازیں پست کر لیتے ہیں۔ وہ لوگ فرط ادب سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر گہری نظر نہیں ڈال سکتے[3]۔

انسانیت کے اپنی محبت کے اظہار کے لیے ایک نقطہ مل گیا تھا۔ جہاں وہ اپنے اعلیٰ جذبات قربان کر سکتے تھے۔ فطری جذبے کی تسکین کر سکتے تھے۔ جذباتی انتشار (dispersion) سے بچ گئے۔ پاکیزگی اور لطف و عنایت نے ایک عمدہ شکل دیکھی۔ محبت و اطاعت کی نئی روایات قائم ہوئیں۔ محبت کے تخلیقی عمل سے کمالات نے جنم لیا۔ لازوال نقوش جنم لینے لگے۔ محبت فاتح عالم

---

[1]۔ تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) از امام ابی جعفر محمد بن جریر طبریؒ۔ جلد 4 صفحہ نمبر 63

[2]۔ نجاشی زمانہ قدیم میں حبشہ موجودہ ایتھوپیا کے بادشاہ کا لقب تھا۔

[3]۔ زاد المعاد از حافظ ابن قیمؒ۔ جلد دوم۔ صفحہ 125

بنتی چلی گئی۔ حضرت اقبالؒ نے کیا صحیح ارشاد فرمایا ہے:

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے[1]

(مسلمانوں کا رہنما وہ شخص ہوسکتا ہے جس کی نگاہ بلند ہو۔ جس کا سخن دلنواز ہو۔ جان پرسوز ہو یعنی وہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مین فنا ہو چکا ہو)

(viii) شخصی عظمت

ان نفسی و اخلاقی عوامل (factors) سے انسان بدلنے لگے۔ جان بلب (dying) انسانیت میں نئی زندگی پیدا ہوگئی۔ دبی صلاحیتیں اجاگر ہوگئیں۔ ان صلاحیتوں کو ایک مرکز مل گیا۔ عربوں کی بربادشدہ قوم میں عظیم الشان انقلاب آ گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو بکریاں چراتے تھے، اس تعلیم و تربیت سے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہلائے۔ تمام دنیا کو اپنی عظمت سے حیران کر گئے۔ تقویٰ اور حکمت کے مجسم پیکر بن گئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عام نوجوان تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی تلوار (سیف اللہ) بن گئے اور روم پر بجلی بن کر گرے۔ حضرت ابو عبید رضی اللہ عنہ عام نرم مزاج کے انسان تھے۔ ہرقل[2] (Heraclius, d. 641) کو ملک شام سے روانہ کرتے ہیں۔ حضرت عمر بن عاص رضی اللہ عنہ اچھے سمجھدار تھے مگر اب مصر کے حاکم بنتے ہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ مالی طور پر عام انسان تھے مگر مدائن میں عراق و ایران کو زیر کرتے ہیں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اپنے ہی ملک کے حاکم بنتے ہیں، مگر جھونپڑی میں رہتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بظاہر جسم

---

[1] ۔غزل؛ بال جبریل از محمد اقبالؒ

[2] ۔ Heraclius؛ ہرقل (575ء–641ء) روم کا بادشاہ تھا جو 610ء سے لے کر 641ء تک برسراقتدار رہا۔

کمزور تھا مگر عظیم ترین عالم بنے۔ علم کی نہریں بہاتے ہیں۔

یہ سب کچھ کیا ہے؟ لگتا ہے کہ کسی نے انسانیت کے ویران خانے میں پہلے دعوت و محبت کے تار بچھائے اور پھر اس میں ایمان کی بجلی جاری کر دی تو بے جان بلب روشن ہو گئے اور دنیا کو روشن کرنے لگے۔ یہ قوت، یہ کمال، انسانیت پر بہت بڑا احسان تھا کہ چرواہوں[1] کو تبدیل کر کے خلیفہ بنا دیا گیا۔ یہ انسانی تبدیلی کا عمل (metamorphosis) غیر معمولی تھا۔ مثالی (ideal) تھا اور رہتی دنیا تک ایک انقلابی عمل تھا۔

اس طرح کے کمالات ان پاک نفسوں نے اجتماعی زندگی میں بھی کیے۔ وہ حق و انصاف کے علم بردار بن گئے۔ ذاتی خواہشات، جاہ و جلال اور عبادت نے ان کی انصاف پسندی میں کوئی کمی پیدا نہیں ہونے دی۔ وہ عہدوں اور حکومتوں سے بھاگتے تھے۔ گریزاں تھے۔ اگر ذمہ داری مل جاتی تو اسے مقدس امانت سمجھتے۔ وہ کسی نسلی یا علاقے کے نمائندے نہ تھے بلکہ پوری انسانیت کے خیر خواہ تھے۔ انسانی شرف کے داعی تھے۔ مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے نے ایک عام مصری شہری کو ایک بار کوڑا مارا اور کہا کہ وہ گورنر کا بیٹا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ مصری اس گورنر زادے سے بدلہ لے اور لڑکے کے باپ (حضرت عمر بن العاص رضی اللہ عنہ) سے کہا کہ تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا ہے حالانکہ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے ہیں۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا امیر المومنین رضی اللہ عنہ مجھے اس واقعہ کا علم نہ تھا اور نہ ہی یہ مصری میرے پاس شکایت لے کر آیا تھا[2]۔

۱۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنی جوانی میں بکریاں چرایا کرتے تھے۔

۲۔ کنز العمال۔ جلد ششم: رقم: 5640

2۔ علمی اثرات

(i) سائنسی فکر

اسلام سے پہلے تو لوگ فطرت کے مظاہر (manifestation) کو پوجتے تھے اور یہی شرک تھا۔ اسلام نے فطرت کے مطالعہ، تلاش وجستجو کا حکم دیا۔ جس سے سائنسی عمل شروع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سے پہلے دنیا میں تجربی (empirical) سائنس جنم نہ لے سکی۔ اسلام سے پہلے تو کائنات انسان کے لیے عبادت کا موضوع (object of worship) تھی۔ اسلام نے اس کو تحقیق کا موضوع (object of investigation) بنایا۔ یہ اسلام کا بہت بڑا سائنسی وعلمی کارنامہ ہے، جس نے تاریخ انسانیت کو یکسر بدل دیا۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹنیکا میں لکھا ہے:

A widespread phenomenon in religions is the identification of natural forces and objects as divinities. It is convenient to classify them as celestial, atmospheric and earthly. this classification itself is explicitly recognized in Indo-Aryan religion: Surya, the sun god, is celestial; Indra, associated with strorms, rain and battles, is atmospheric; and Agni, the fire god, operates primarily at the earthly level[1].

اسلام نے دنیا کو سائنسی معیار دیا۔ اسلام سے پہلے لوگ پرانی علمی روایتوں کو بغیر تجربے کے مان

---

[1]۔ Encyclopedia of Britanica, vol. 14, p. 785

لیتے تھے۔ برٹرینڈ رسل[1] (Bertrand Russell, d. 1970) نے صحیح کہا ہے کہ یونان والے تجربے اور مشاہدے کے خلاف تھے۔ یونان کے سب سے بڑے فلسفی اور سائنسدان ارسطو (Aristotle, d. 322BC) کی رائے میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے دانت کم ہوتے ہیں۔ اس کو یہ بھی خیال نہ آیا کہ اپنی دو بیویوں میں سے کسی کا منہ کھول کر دیکھ ہی لیتا۔

To modern educated people, it seems obvious that matters of fact are to be ascertained by observation, not by consulting ancient authorities. But this is an entirely modern conception, which hardly existed before the seventeenth century. Aristotle maintained tha women had fewer teeth than men; althought he was twice married, it never occurred to him to verify this statement by examining his wives mouth[2].

---

[1]۔ Bertrand Arthur William Russell؛ برٹرینڈ آرتھر ولیمز رسل (1872ء-1970ء) ایک معروف محقق، مورّخ، سائنسدان، ماہر ریاضیات، ماہر طبیعیات، مدرّس اور فلسفی تھے۔ 1970ء میں یہ ادیب دنیا سے رخصت ہوگیا۔ برٹرینڈ رسل کے علمی اور فلسفیانہ کاموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ فلسفہ، سائنس، تاریخ، سیاست، معاشرت، جنگ، امن، جنس، قانون اور انسانی ہمدردی پر برٹرینڈ رسل کی علمی اور تحقیقی کتب اور کتابچوں کی تعداد سینکڑوں میں پہنچتی ہے۔ 1950ء میں ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا، یہ واحد اعزاز تھا جو انہوں نے قبول کیا۔ ایٹمی سائنسدانوں کو انسانیت کا قاتل قرار دیا۔ درازیٔ عمر کے باوصف رسل نے دمِ آخر تک اپنا وقت کارِ قلم میں گزارا۔

[2]۔ The Impact of Sciences on Society by Bertrand Arthur William Russell, p.17

رابرٹ بریفالٹ[1] (Robert Briffault, d. 1948) تو یہاں تک کہتا ہے کہ جدید سائنس خود اسلام کی پیدا کردہ ہے۔ اہل یونان نے سائنس شروع کی لیکن باقاعدہ سائنسی طریقہ، تجربات و تحقیق عربوں نے ایجاد کیے۔ یہی فکر ہے جس نے بعد میں یورپ میں سائنسی انقلاب برپا کیا۔

بریفالٹ (Robert Briffault, d. 1948) کی رائے میں:

> *The debt of our science to that of the Arabs deos not consist in startling discoveries of revolutionary theories; science owes a great deal more to Arab culture, it owes its existence. The ancient world was, as we knwo, pre-scientific. The Astronomy and Mathematics of the Greeks were a foreign importation never thoroughly acclimatized in Greek culture. The Greeks systematized, generalized and theorized, but the patient ways of investigation, the accomulation of positive knowledgem the minute method of science, detailed and prolonged observation and experimental inquiry were altogether alien to the Greek temperament. Only in Hellenistic Alexandria was any approach to scientific work conducted in the ancient classical world. What we call science arose in Europe as a result of a new spirit of inquiry, of new methods of investigattion, of the method of experiment, observation, measurement, of the development of Mathematics in*

---

[1]۔ Robert Stephen Briffault؛ رابرٹ سٹیفن بریفالٹ (1874ء-1948ء) ایک فرانسیسی ماہر سرجن تھا۔ جس نے بطور social anthropologist اور ایک ناول نگار کے شہرت حاصل کی۔

a form unknown to the Greeks. that spirit and those methods were introduced into the European world by Arabs[۱]*.*

موجودہ زمانے میں ہم سائنس وٹیکنالوجی کی تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں زمین وآسمان کی چیزوں پرغور کرنے پر بہت زور دیا گیا ہےاور یہی سائنس ہے۔اس سے معرفت پیدا ہوتی ہے۔مسلمانوں کی تاریخ بھی اس بات پر گواہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں مسلمانوں نے سائنس میں بہت ترقی کی۔عہد حاضر کے مشہور برطانوی مفکر وفلسفی برٹرینڈرسل (Bertrand Russell, d. 1970) نے اس حقیقت کا برملا اظہار کیا ہے کہ جس زمانے میں یورپ میں سائنس کی ابتدا نہیں ہوئی تھی اور یورپ تاریک زمانے (dark age) میں تھا اس وقت ہندوستان سے لے کر سپین تک اسلام کی شاندار تہذیب چھائی ہوئی تھی۔

Our use of phrase 'the Dark Ages' to cover the period from 600 to 1000, marks our undue concentration on Western Europe. In China, this period includes the time of the Tang Dynasty, the greatest age of Chinese poetry and in many other ways a most remarkable epoch. From India to Spain the brilliant civilization of Islam flourished.What was lost to Christendom at this time was not lost to civilization, but quite the contrary[۲]*.*

۱۔ Making of Humanity by Robert Stephen Briffault, p. 190

۲۔ A History of Western Philosophy by Bertrand Arthur William Russell, p.372

(ii) طب

قرونِ وسطیٰ (middle ages) میں مسلمانوں نے سائنس میں حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیئے۔ الرازی[1] (al-Razi, d. 925) اور ابن سینا (Avicenna, d. 1037) اپنے زمانے کے سب سے بڑے طبیب (physician) تھے۔ ابن سینا (Avicenna, d. 1037) کی کتاب القانون 1650 تک یورپ کے نصاب تعلیم میں شامل تھی۔

الزہراوی (al-Zahrawi, d. 1013) کی سرجری سے متعلق کتاب التصریف کا گیراڈ آف کریمونا[2] (Gerard of Cremona, d. 1187) نے عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔ یورپ میں اس کے مختلف ایڈیشن چھپے۔ وینس (Venice) میں 1497ء میں باسل (Basel) میں 1541ء میں اور آکسفورڈ میں 1778ء میں چھپا۔ یہ ترجمہ کئی صدیوں تک یورپ کے میڈیکل سکولوں میں بطور نصاب پڑھایا جاتا رہا[3]۔

عربوں نے دواؤں کے علم (Pharmacology) کو ترقی بخشی۔ انہوں نے تقطیر (distillation) اور تصعید (sublimation) جیسے عمل ایجاد کیے جو جدید دوا سازی کی بنیاد ہیں۔ الزہراوی

---

[1]۔ Abu Bakr Muhammad ibn Zakariyya al-Razi؛ ابوبکر محمد بن زکریا الرازی (854ء-925ء) مسلمان سائنسدان، ماہرِ طبیعیات، ہیئت دان اور فلسفی تھے۔

[2]۔ Gerard of Cremona؛ گیراڈ آف کریمونا (1114ء-1187ء) ایک اطالوی مترجم (translator) تھا۔ جس نے بے شمار سائنسی کتب کا عربی زبان سے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔

[3]۔ The Arabs: A Short History by Phillip Khuri Hitti, p.577

(al-Zahrawi, d. 1013) کی سرجری سے متعلق کتابیں 1778 میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے چھاپیں۔

الرازی(al-Razi, d. 925)اور ابن سینا(Avicenna, d. 1037) کی تصاویر اب بھی پیرس یونیورسٹی کے سکول آف میڈیسن کے بڑے ہال میں سجی ہوئی ہیں۔ ابن مساویہ [1] (Ibn Masawayh, d. 857) نے دنیا میں سب سے پہلے آنکھوں کی امراض (ophthalmology) کی کتاب عشر مقالات فی العین (آنکھ پر دس مضامین) لکھی [2]۔

(iii) کیمیا

جابر بن حیان [3](Jabir ibn Hayyan, d. 806) جدید علم کیمیا(Chemistry) کا بانی ہے۔ اس نے کیمسٹری میں تکسید(calcination)اور تخفیف(reduction) کے عمل کے فارمولے بنائے۔ اس نے عمل تبخیر(evaporation) عمل تصعید(sublimation) پگھلانے(melting)اور قلم پذیری (crystallization) کے عمل کے فارمولے کو بہتر کیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے

---

[1]- Ibn Masawayh؛ یوحنا بن مساویہ (777ء- 857ء) ایک نسطوری عیسائی طبیب اور بغداد کے ایک ہسپتال کا ڈائریکٹر تھا۔ اس نے متعدد موضوعات بشمول امراض چشم، بخار، درد سر، مالیخولیا، غذائیات اور طبی اقوال سے متعلق علمی مقالے لکھے۔ اس نے متعدد یونانی کتابوں کا شامی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس نے تشریح الابدان پر بھی لکھا۔

[2]- The Arabs: A Short History by Phillip Khuri Hitti, p.364

[3]- Abu Musa Jabir ibn Hayyan؛ ابو موسیٰ جابر بن حیان (721ء- 806ء) تاریخ کا سب سے پہلا کیمیادان اور عظیم مسلمان سائنسدان تھا۔ جس نے سائنسی نظریات کو دینی عقائد کی طرح اپنایا۔ دنیا آج تک اسے بابائے کیمیا کے نام سے جانتی ہے۔ اہل مغرب اسے Geber کے نام سے جانتے ہیں۔

گندھک کا تیزاب (sulphuric acid) اور شورے کا تیزاب (nitric acid) بھی بنائے۔

(iv) ریاضی

الخوارزمی (al-Khwarizmi, d. 850) کی کتاب حساب الجبر والمقالہ (The calculation of Integration and Equation) الجبرا کی پہلی کتاب ہے۔ جس کا بارھویں صدی میں ترجمہ ہوا اور کئی صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں بطور نصاب پڑھائی جاتی رہی۔ اس نے عربی نمبر (Algorisms) بھی متعارف کروائے۔

مسلمانوں نے علم الحساب (arithmatic) کو نئی جہتیں دیں۔ اعداد (numbers) کے حساب کو ترتیب دی۔ الخوارزمی (al-Khwarizmi, d. 850) نے نویں صدی میں صفر (zero) کا پہلی بار استعمال کیا۔ البیرونی[1] (al Biruni, d.1048)، ابن سینا (Avicenna, d.1037)، الکرجی[2] (al-Karaji, d. 1029) اور ابو سعید سجزی (d. 1024) وغیرہ نے عدد تام (perfect numbers)، متعادلان (equivalents)، متحابان (amicable numbers) اور مثلثات (Triangular numbers) وغیرہ بنائے۔ اسی طرح مربع (sequare) کے قوانین بنائے۔ اس علم میں مسلمانوں کے کمال کا اندازہ اس بات لگایا جا سکتا ہے کہ البیرونی (al-Biruni, d.

---

[1] ۔ Abu Rayḥan Muhammad ibn Aḥmad Al-Biruni؛ ابوریحان محمد بن احمد البیرونی (973ء-1048) ایک نامور مسلمان محقق اور سائنس دان تھے۔ البیرونی نے ریاضی، علم ہیئت، تاریخ اور جغرافیہ میں ایسی عمدہ کتابیں لکھیں جو اب تک پڑھی جاتی ہیں۔

[2] ۔ Abu Bakr ibn Muḥammad ibn al Ḥusayn al-Karaji؛ ابو بکر بن محمد بن الحسین الکرجی (953ء-1029ء) ایک ماہر ریاضی دان اور انجنیئر تھے۔

1048) نے (1040ء) میں 1616-1 کی صحیح قدر (value) معلوم کر لی تھی۔ حالانکہ اس زمانے میں حساب کرنے والی مشینیں (calculators) ایجاد نہیں ہوئے تھے[1]۔

مسلمانوں نے الجبرا (algebra) کو بھی کمال بخشا۔ الخوارزمی ((al-Khwarizmi, d. 850) نے algoritham بنایا۔ اس نے پہلے اور دوسرے درجے کی الجبریاتی مساواتیں (equations) بنائیں۔ جابر بن سنان البتانی[2] (Jabir ibn Sinan al-Battani, d. 929) جدید integral calculus کا بانی کہلایا جاسکتا ہے۔ ابو وفا[3] (Abu al-Vafa, d. 998) نے چوتھے درجے کی مساواتیں (algebric equation) اور البیرونی (al-Biruni, d. 1048) نے عمل (function) کو رواج دیا جو لائبنیز[4] (Leibniz, d. 1716) کی ریاضی کے بعد اس مضمون میں سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اس طرح الفخری نے square roots اور theory of indices

---

[1]۔ A History of Muslim Philosophy by M. M. Sharif, p.1279

[2]۔ Abu ʿAbd Allah Muḥammad ibn Jabir ibn Sinan al-Raqqi al-Ḥarrani aṣ-Ṣabiʾ al-Battani؛ جابر بن سنان البتانی (858ء-929ء) کا شمار دنیا کے عظیم ترین فلکی سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ان کے وہ اہم نظریات ہیں جو انہوں نے اس میدان میں وضع کیے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جبر، حساب اور مثلثات میں بھی کافی نظریات متعارف کروائے۔

[3]۔ ابوالوفاء ایک عظیم ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا جس نے بے شمار کتابیں لکھیں اور یونانی زبان سے عربی زبان میں ریاضی کی کتب کا ترجمہ بھی کیا۔

[4]۔ Gottfried Wilhelm Leibniz؛ گوٹفریڈ ویلہم لائبنیز (1646ء-1716ء) ایک جرمن ریاضی دان اور فلسفی تھا۔ تاریخ ریاضی اور تاریخ فلسفہ میں اُس کا ایک نمایاں مقام ہے۔ اس نے اور نیوٹن نے ایک ہی دور میں الگ الگ کام کرتے ہوئے حسابان کی دریافت کی اور اس کے شائع ہونے سے آج تک للائبنیز کی علامتیں ہی حسابان میں استعمال ہوتی ہیں۔ اس نے ثنائی اعداد کے نظام کو بھی بہتر کیا جو تقریباً ہر شمارندہ کی بنیاد ہے۔

وغیرہ معلوم کیں۔ عمر خیام[1] (Omar Khayyam, d. 1131) نے گیارویں صدی میں binomial expression of positive integral دریافت کیں۔ جس کی بنیاد پر نیوٹن[2] (Newton, d. 1727) نے سترھویں صدی میں اپنا binomial theorem پیش کیا۔ اس طرح مسلمانوں نے geometry اور trignometry میں بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیئے[3]۔

عمر خیام (Omar Khayyam, d. 1131) نے ایک کیلنڈر بنایا جو گریگوری (gregorian) کیلنڈر سے بھی زیادہ بہتر ہے۔ گریگوری کے کیلنڈر میں 3330 سالوں میں ایک دن کی غلطی ہوتی ہے جبکہ خیام کے کیلنڈر میں 5000 سالوں میں بھی ایک دن کی غلطی آتی ہے[4]۔

---

[1]۔ عمر خیام (1048ء-1131ء) علم ہیت اور علم ریاضی کا بہت بڑا افاضل تھا۔ ان علوم کے علاوہ شعر وسخن میں بھی اس کا پایا بہت بلند ہے۔ اس کے علم وفضل کا اعتراف اہل ایران سے بڑھ کر اہل یورپ نے کیا۔

[2]۔ Sir Isaac Newton؛ سر آئزک نیوٹن، (1673ء-1727ء) ایک مشہور معروف طبیعیات دان، ریاضی دان، ماہر فلکیات، فلسفی اور کیمیا دان تھا۔ جس کا شمار تاریخ کی انتہائی اہم شخصیات میں ہوتا ہے۔ 1687ء میں چھپنے والی اس کی کتاب قدرتی فلسفہ کے حسابی اصول (Philosophiæ Naturalis Principia Mathematica) سائنس کی تاریخ کی اہم ترین کتاب مانی جاتی ہے۔ جس میں کلاسیکی میکینکس کے اصولوں کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی کتاب میں نیوٹن نے کشش ثقل کا قانون اور اپنے تین قوانین حرکت بتائے۔ یہ قوانین اگلے تین سو سال تک طبیعیات کی بنیاد بنے رہے۔ نیوٹن نے ثابت کیا کہ زمین پر موجود اجسام اور سیارے اور ستارے ایک ہی قوانین کے تحت حرکت کرتے ہیں۔ اس نے اپنے قوانین حرکت اور کیپلر کے قوانین کے درمیان مماثلت ثابت کر کے کائنات میں زمین کی مرکزیت کے اعتقاد کو مکمل طور پر ختم کر دیا اور سائنسی انقلاب کو آگے بڑھانے میں مدد دی۔

[3]۔ A History of Muslim Philosophy by M. M. Sharif, vol. 2, p.1283

[4]۔ The Arabs: A Short History by Phillip Khuri Hitti, p.377

(v) ہیئت

مسلمانوں نے علم ہیئت (Astronomy) میں بھی کمال پیدا کیا۔ بہت سے ستاروں کے نام اور اصطلاحات عربی زبان سے آئیں ہیں۔ چند مثالیں پیش ہیں[1]:

ستارے کا نام/ اصطلاحات	عربی ماخذ (origin)
Crab	عقرب (Scorpion)
Algedi	الجدی (The Kid)
Altair	الطیر (The Flyer)
Deneb	دنب (Tail)
Pherkad	فرقاد (Calf)
Azimuth	السموت
Nadir	نذیر

(vi) جغرافیہ

مسلمانوں نے جغرافیائی سائنس میں بھی کمال پیدا کیا۔ فلپ ہٹی[2] (Philip Hitti, d. 1978)

۱۔ The Arabs: A Short History by Phillip Khuri Hitti, p.572 - 73

۲۔ Philip Khuri Hitti؛ فلپ خوری ہٹی (1886ء–1978ء) ایک امریکی مستشرق تھا جو لبنان میں پیدا ہوا۔ اس نے بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ 1915ء میں کولمبیا یونیورسٹی کے مشرقی علوم کے شعبے میں لیکچرر مقرر ہوا اور آٹھ سال تک پروفیسر رہا۔ اس کے بعد پرنسٹن یونیورسٹی امریکا چلا گیا۔ 1916ء میں 'اسلامی ریاست کی ابتدا' نامی ایک کتاب لکھی لیکن ان کی شہرت 'تاریخ عرب' کی وجہ سے ہے جو 1937ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔

نے لکھا ہے کہ الادریسی[1] (al-Idrisi, d.1154) بارھویں صدی بلکہ قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا جغرافیہ دان تھا۔ یورپ کے ممالک کے حکمران اس سے نقشے بنواتے تھے۔ ادریسی سسلی (Sicilly) کے نارمن بادشاہ راجر دوئم[2] (Ruger-ii, d. 1154) کا ذاتی دوست اور مشیر تھا۔ ادریسی نے راجر کے دربار میں سرکاری نقشہ نویس کی حیثیت سے کام کیا اور اس کے لیے 1154ء میں دنیا کا نقشہ بنایا[3]۔ البیرونی (al-Biruni, d. 1048) نے موجودہ پاکستان کے علاقے (Rohts Fort) میں زمین کے قطر (radius) کی پیمائش کی جو عہد حاضر کے تسلیم شدہ قطر سے صرف 15 کلومیٹر کم ہے۔

جغرافیہ کے علم نے مسلمانوں کو سیاحت و سمندری سفر میں دسترس بخشی۔ یہاں تک کہ یورپ اور ہندوستان کے درمیان سمندری راستہ کی دریافت بھی مسلمان ملاحوں کی مرہون منت ہے۔ واسکوڈے گاما (Vasco da Gama, d. 1524 [4]) ایک پرتگالی ملاح تھا۔ اس نے 1697ء میں ہندوستان اور یورپ کے درمیان راستہ دریافت کیا جو Cape of Good Hope سے ہو کر جاتا تھا۔ یہ عظیم کامیابی اس کو ایک عرب ملاح احمد بن ماجد کے ذریعے حاصل ہوئی۔ یہ ملاح اس کو

---

[1]۔ Abu Abdullah Muhammad al-Idrisi al-Qurtubi al-Hasani as-Sabti؛ الادریسی (1099ء-1154ء) ایک اندلسی عرب نقشہ نویس، جغرافیہ دان اور سیاح تھا۔

[2]۔ Roger II؛ راجر دوئم (1099ء-1154ء) سسلی کا بادشاہ تھا۔

[3]۔ Encyclopedia of Britanica, Vol. 11, p.472

[4]۔ Vasco da Gama؛ واسکوڈے گاما (1460ء-1524ء) ایک پرتگالی بحری قزاق تھا جس نے جنوبی افریقہ کے گرد گھوم کر ہندوستان تک کا بحری راستہ دریافت کیا۔

موزنبیق کے سلطان نے مہیا کئے تھے[1]۔

امریکہ کی دریافت میں بھی مسلمانوں کا ہاتھ ہے۔ یہ عظیم دریافت کولمبس[2] (Columbus, d. 1506) نے کی۔ فلپ ہٹی (Philip Hitti, d. 1978) لکھتا ہے کہ مسلمانوں نے زمین کے گول ہونے کے قدیم نظریے کو زندہ رکھا جس کے بغیر امریکہ کی دریافت ممکن نہ تھی۔ اس نظریہ کا ایک مبلغ ابوعبیدہ مسلم البالیسنی تھا۔ جس نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اس کا زمانہ دسویں صدی عیسوی کا نصف اول ہے۔ زمین کے گول ہونے کا نظریہ عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہو کر 1410ء میں یورپ میں شائع ہوا۔ اس کو پڑھ کر کولمبس نے اس نظریہ سے واقفیت حاصل کی[3]۔

(vii) قانون

علم قانون میں مسلمانوں نے شاندار کارنامے سرانجام دیئے۔

(ا) اصول قانون خالصتاً مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ قانون تو روم، یونان، چین، ہندوستان اور عراق وغیرہ میں اسلام کی بعثت سے بہت پہلے موجود تھا مگر اصول قانون (jurisprudence) کی ابتدا امام ابوحنیفہؒ (Abu Hanifa, d. 772) نے کتاب الرائے سے کی۔ ان کے

---

[1]۔ Encyclopedia of Britanica, Vol 7, p.761

[2]۔ Christopher Columbus؛ کرسٹوفر کولمبس (1451ء-1506ء) ایک بحری مہم جو تھا جس نے 1492ء میں امریکہ کو دریافت کیا۔

[3]۔ The Arabs: A Short History by Phillip Khuri Hitti, p.570

شاگرد امام ابو یوسفؒ (Abu Yusuf, d. 798 [1]) نے کتاب الاصول لکھی اور امام شافعیؒ [2] (Shafi, d. 767) نے انسانی تاریخ میں پہلی بار اپنی کتاب الرسالہ فی اصول الفقہ میں اصول قانون، قانون سازی، تعبیر کے اصولوں وغیرہ پر باقاعدہ سیر حاصل بحث کی۔

(ب) مسلمانوں نے ہی قوانین کا تقابلی مطالعہ (comparative law) شروع کیا۔

(ج) قانون میں نیت (intention) کی اہمیت پہلی بار مسلم قانون دانوں نے بیان کی۔ اب ہم غلط نیت (mens rea) کے بغیر کسی جرم کو جرم نہیں مانتے۔

(د) مسلمانوں نے پہلی بار قانون کو اخلاقی بنیاد مہیا کی جس سے قانون پر عمل کرنا آسان ہو گیا۔

(ہ) بین الاقوامی قانون کے علم کی باقاعدہ ابتدا امام ابو حنیفہؒ (Abu Hanifa, d. 772) کے استاد امام زید بن علی زین العابدین (Zaid Ibn Ali, d. 740) نے اپنی کتاب المجموعہ سے کی۔ امام محمد الشیبانیؒ [3] (Muhammad al-Shaybani, d. 805) نے اس

---

[1]۔ امام ابو یوسفؒ (735ء-798ء) امام ابو حنیفہؒ کے جلیل القدر شاگرد اور حنفی مذہب کے ایک امام تھے۔ آپؒ کا اصل نام یعقوب بن ابراہیمؒ تھا۔ آپؒ تاریخ اسلام میں وہ پہلے شخص ہیں جن کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے خطاب سے نوازا گیا۔ آپ کی مشہور تصنیف کتاب الخراج فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

[2]۔ محمد بن ادریس بن العباس شافعیؒ (768ء-819ء) ایک مشہور و معروف فقیہی تھے۔ جنھوں نے ایک نئے مسلک شافعی کی بنیاد ڈالی۔ آپؒ کی کتاب الرسالہ اصول فقہ کی پہلی کتاب ہے۔

[3]۔ امام محمد بن حسن شیبانیؒ (749ء-805ء) امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد اور مشیر خاص تھے۔ امام ابو یوسفؒ کے بعد آپؒ جید شاگرد تھے۔ استاد کے نظریات کو تدوین کرنے میں ان کی محنت بھی شامل تھی۔ آپؒ نے بین الاقوامی قانون پر کتاب السیر لکھی۔

موضوع پر دو کتابیں کتاب السیر الصغیراور کتاب السیر الکبیر لکھیں۔جن کا انگریزی ترجمہ امریکن یونیورسٹی آف بیروت کے عیسائی پروفیسر مجید خدوری نے کیا اور دستیاب ہے۔ امام سرخسیؒ[1] (al-Sarakhsi, d. 1093) نے اس کتاب کی شرح چار جلدوں میں لکھی۔ یہ کتاب Oppenheim کی کتاب انٹرنیشنل لا (بین الاقوامی قانون) سے بھی بڑی ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ بین الاقوامی قانون پر پہلی باقاعدہ کتاب ولندیزی عالم ہوگوگروشیئش[2] (Hogo Grotius, d. 1645) نے 1645ء میں لکھی تھی جس کا نام De Jure Belli ac Pacis (Law of war and peace) ہے۔

(viii) دیگر علوم

مسلمانوں نے فنون لطیفہ کو فروغ دیا۔خاص طرز کی مصوری کو فروغ دیا۔خوش نویسی (calligraphy) کو متعارف کرایا۔کشیدہ کاری اور قالین سازی کی بنیاد رکھی۔لکڑی، ہاتھی دانت اور ہڈیوں پر نقاشی اور کندہ کاری کو رواج دیا۔

کاغذ کو بہتر بنا کر مسلمانوں نے دنیا پر احسان کیا۔مراکش میں کاغذ بننا شروع ہوا۔وہاں سے ہوتا ہوا سپین اور یورپ پہنچا۔کاغذ کے بغیر کتابیں نہ پھیل سکتیں۔کاغذ کے پیمانہ کا لفظ ریم (ream) بھی عربی زبان سے آیا ہے۔

---

[1]۔ شمس ائمہ محمد بن احمد ابوبکر امام سرخسیؒ (متوفی 438ہجری) ایک مشہور ومعروف حنفی سکالر تھے جن کا تعلق ایران کے شہر سرخس سے تھا۔اسی شہر کی نسبت سے سرخسی مشہور ہو گئے۔آپؒ کی مشہور کتاب المبسوط فی الفقہ ہے۔

[2]۔ Hogo Grotius؛ ہوگوگروشیئش (1582ء-1645ء) ایک ولندیزی ماہر قانون تھا۔

آج اگر اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل میں جائیں تو ہر دوسرا آدمی کوئی غیر ملکی ماہر (consultant) ہوگا۔ ایک وقت تھا کہ ہم مغرب کو ماہرین مہیا کرتے تھے۔ انگلستان کے بادشاہ اوفاریکس (Offa Rex, d. 796) نے سونے کے سکے ڈھلوانے کے لیے بغداد سے سکہ گر بلائے تھے۔ وہ سکے اب بھی برٹش میوزیم لندن میں کوجود ہیں جس میں ایک طرف تو بادشاہ کا نام لکھا ہوا ہے تو دوسری طرف عرب سکہ گر کا نام ہے۔

(ix) مغرب کو علم کی منتقلی

مسلمانوں کے یہ علوم سسلی، سپین اور روم کی وساطت سے پورے یورپ میں پھیل گئے۔ گیراڈ آف کریمونا (Gerad of Cremona, d. 1187) اور مائیکل سکاٹ[1] (Michael Scot, d. 1232) نے مسلمانوں کے کاموں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کر کے ان کو یورپ کے لیے مفید بنایا۔ سپین کے شہر تولیدو (Toledo) میں 1135ء سے 1284ء تک مسلمانوں کی اکثر اہم کتب کے یورپی زبانوں میں ترجمے ہو چکے تھے۔ رابرٹ چسٹر[2] (Robert of Chester, d. n.d.) نے 1145ء میں خوارزمی کی کتاب الجبراء کا ترجمہ کیا۔ اڈیلارڈ[3] (Adelord of Bath, d.

---

[1]- Michael Scot؛ مائیکل سکاٹ (1175ء-1232ء) ایک سکاٹ لینڈ کا ماہر ریاضی اور فلاسفر تھا۔ اس نے ابن رشد کے تحقیقی کام کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔

[2]- Robert of Chester؛ رابرٹ چیسٹر بارہویں صدی کا ماہر مترجم تھا جس نے خوارزمی اور جابر بن حیان کی عربی کتب کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔

[3]- Adelard of Bath؛ اڈیلارڈ (1080ء-1152ء) انگلش فلاسفر تھا۔ اس کی وجہ شہرت عربی زبان سے لاطینی اور جرمن میں کتب کے ترجمہ کرنے سے ہے۔

(1152 نے 1126ء میں مسلمہ المجریطی[1] (Maslama al-Majriti, d. 1007) کی ہئیت (Astronomy) سے متعلق کتابوں کا ترجمہ کیا۔ مائیکل سکاٹ(Michael Scot, d. 1232) نے 1236ء میں ابن رشد(Averroes, d. 1198) کی کتب فلسفہ اور ابن سینا(Avicenna, d. 1038) کی حیاتیات سے متعلق کتب کے تراجم کیے۔ گیراڈ آف کرمونا (Gerad of Cremona, d. 1187 نے کل 71 کتب کے ترجمے کیے۔

مسلمانوں کے ان علمی کارناموں کا مغربی فکر پر بہت گہرا اثر پڑا۔ مثال کے طور پر:

(i) اس سے انسان دوستی کی تحریک(Humanistic Movement) شروع ہوئی۔

(ii) تاریخی علوم(Historical Sciences) شروع ہوئے۔

(iii) سائنسی تجربہ ومشاہدہ شروع ہوا۔

(iv) فلسفہ اور عقیدہ میں باہمی تفہیم پیدا ہوئی۔

(v) تصوف کی تحریک نے جنم لیا۔

(vi) کانٹ(Immanuel Kant, d. 1804) تک مغرب اسلامی فکر سے متاثر رہا وغیرہ۔

مسلمان انسان دوست تھے۔ انہوں نے مغرب کو انسان دوستی کا سبق دیا۔ انہوں نے اہل مغرب کو بتایا کہ عیسائیت سے باہر بھی انسانیت ہے۔ انہوں نے یونان کے علوم کو پڑھا، سمجھا اور یورپ

---

[1]۔Maslama al-Majriti؛ مسلمہ المجریطی (950ء-1007ء) کا نام ابوالقاسم مسلمہ بن احمد ہے۔ المجریطی ماہر ریاضی دان تھے اور اندلس میں ریاضی دانوں کے امام کہلاتے تھے۔ علم فلکیات، کیمیا اور دیگر علوم پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ کیمیا میں ان کی کتب رتبہ الحکم اور غایہ الحکیم بہت مشہور ہیں۔

کو منتقل کیا۔ بغداد میں دارالحکومت قائم ہونے کے آٹھ سال کے اندر اندر مسلمانوں نے یونان کا تمام ذخیرہ علم و کتب اپنے ہاں جمع کرلیا۔

قرآن پاک کا بہت سا حصہ پرانی قوموں کے عروج و زوال سے بحث کرتا ہے اور تاریخ کو علم کا ایک حصہ مانتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں میں ہیروڈوٹس[1] (Herodotus, d. 425BC) کے بعد پہلی بار یعقوبی[2] (al-Yaqubi, d. 897)، طبری[3] (al-Tabari, d. 923)، مسعودی[4] (al-Mas'udi, d. 695)، ابن خلدون[5] (Ibn Khaldun, d. 1406) اور البیرونی (al-Biruni, d. 1048) جیسے تاریخ دان پیدا ہوئے۔ البیرونی (al-Biruni, d. 1048) نے

---

[1]۔ Herodotus؛ ہیروڈوٹس (425BC-481BC) ایک قدیم یونانی مؤرخ تھا جسے ابوالتاریخ یعنی تاریخ کا باپ بھی کہا جاتا ہے۔

[2]۔ Ahmad ibn Abu Ya'qub ibn Ja'far al-Ya'qubi؛ احمد ابن ابو یعقوب ابن جعفر ابن وہب ابن ودیع الیعقوبی المعروف یعقوبی (d. 897) ایک مسلمان جغرافیہ دان اور مسلم دنیا کے قرون وسطی کے پہلے مورخ تھے۔ تاریخ یعقوبی اسلامی تاریخ پر ان کی مشہور ترین کتاب ہے۔

[3]۔ Abu Ja'far Muhammad ibn Jarir al-Ṭabari؛ ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری ؒ (838ء-923ء) مشہور مسلم مفسر مورخ تھے۔

[4]۔ Abu al-Hasan Ali ibn al-Husayn al-Mas'udi؛ ابوالحسن علی بن حسین بن علی مسعودی (896ء-956ء) مشہور مسلم مؤرخ، جغرافیہ دان اور سیاح تھے۔

[5]۔ Abd ar-Raḥman ibn Muhammad ibn Khaldun؛ علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون (1332ء-1406ء)، ایک مورخ، فقیہ، فلسفی اور کامیاب سیاستدان تھے۔ آپ کو تاریخ اور عمرانیات کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ مقدمہ فی التاریخ ہے جو مقدمہ ابن خلدون کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تاریخ، سیاست، عمرانیات، اقتصادیات اور ادبیات کا گراں مایہ خزانہ ہے۔

پہلی بارتاریخ پرتنقید کےاصول متعارف کرائے۔

ابن خلدون (Ibn Khaldun, d. 1406) کا مقدمہ (Prolegomena) بہت مشہور ہے۔ اس کتاب میں اس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار تاریخی ترقی کے اصول بیان کیے۔ تاریخ پر موسم، ماحول، اخلاقی اور روحانی قوتوں کے اثرات کا جائزہ لیا۔ اس نے قوموں کی ترقی وتنزلی (عروج و زوال) کے قوانین بنائے۔ اس لیے انہیں بجا طور پر جدید تاریخ وعمرانیات (sociology) کا بانی کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں کا مغرب پر سب سے بڑا احسان سائنسی (scientific) اور استخراجی (inductive) طریقہ تحقیق ہے۔ رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault, d. 1948) نے لکھا ہے کہ آکسفورڈ یونیورسٹی اور راجر بیکن[1] (Roger Bacon, d. 1294) بنیادی طور پر عربوں کے علم کے زیر اثر آگے بڑھے[2]۔

مغرب میں پندرویں صدی تک سائنس اور فلسفہ کی تعلیمات کو مذہب کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے ارسطو (Aristotle, d. 322BC) اور ابن سینا (Avicenna, d. 1037) کی تعلیمات

---

[1]۔ Roger Bacon؛ راجر بیکن (1214ء-1294ء) ایک انگریز فلسفی اور راہب تھا۔ یہ ایک عرصہ تک پیرس میں ارسطو کے فلسفے پر لیکچر دیتا رہا۔ کئی کتابوں کا مصنف ہے جن میں اون میر ر اور پوپ کلیمنٹ زیادہ مشہور ہیں۔ اسے 1277ء میں کیتھولک کلیسا نے مجرم قرار دیا اور قید میں ڈال دیا وہیں وفات پائی۔

[2]۔ Making of Humanity by Robert Stephen Briffault, p.200

یہاں ممنوع تھیں۔ برونو[1] (Giordano Bruno, d. 1600) کو جلا دیا گیا۔ کیپلر[2] (Kepler, d. 1630) کوسزا دی گئی۔ گیلیلیو[3] (Galilio, d. 1642) کومجبور کیا گیا کہ وہ اپنے نظریات سے لاتعلقی کا اظہار کرے۔ اس کے برعکس مسلمان معاشرے میں سائنس اور مذہب میں ہم آہنگی پیدا کی گئی۔ جس کے سبب یہاں سائنس اور فلسفہ نے ترقی پائی اور پھر مغرب نے بھی اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

مغربی علما عام طور پر یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ مغرب اسلامی تصوف سے بہت متاثر ہوا ہے۔ گوئٹے[4] (Goethe, d. 1832) پر ایران کی صوفیانہ شاعری کا بہت گہرا اثر ہے۔ دانتے[5]

---

[1]۔ Giordano Bruno؛ گیوردانو برونو (1548ء-1600ء) ایک اطالوی فلسفی اور ریاضی دان تھا جو اپنی جوانی میں راہب تھا لیکن روشن خیالی کے باعث کلیسا نے اس پر کفر کا الزام لگایا اور اسی جرم کی پاداش میں اسے زندہ جلا دیا گیا۔

[2]۔ Johannes Kepler؛ جان کیپلر (1571ء-1630ء) ایک جرمن ماہر فلکیات، ریاضی دان اور سترھویں صدی کے سائنسی انقلاب کی ایک بہت اہم شخصیت تھا۔ وہ سیاروں کی حرکت کے قوانین دریافت کرنے کے لیے مشہور تھا جس کی بعد میں آنے والے ماہر فلکیات نے تصدیق کی۔ اس کی تحقیق نیوٹن کی تحقیقات کی بنیاد بنی۔

[3]۔ Galilio Galilei؛ گیلیلیو (1564ء-1642ء) ایک اطالوی ماہر فلکیات اور فلسفی تھا۔ گیلیلیو نے اشیا کی حرکات، دوربین، فلکیات کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کیں۔ اسے جدید طبیعیات کا باپ کہا جاتا ہے۔

[4]۔ Johann Wolfgang von Goethe؛ گوئٹے (1749ء-1832ء) ایک جرمن ادیب تھا جو شاعری، ڈراما، ادب، فلسفہ، الٰہیات، عرض بے شمار اصناف میں لکھتا رہا۔ اس کا شمار عالمی ادب کے گنے چنے قافلہ سالاروں میں شمار ہوتا ہے۔

[5]۔ Durante degli Alighieri؛ دانتے الگیری (1265ء-1321ء) اٹلی کا مشہور شاعر تھا۔ اس کی شہرہ آفاق تمثیلی نظم طربیہ خداوندی 'ڈیوائن کامیڈی' میں شاعر کی روح دوزخ اعراف اور جنت کا سفر کرتی ہے۔

(Durante, d. 1321) کی Divine Comedy پر ابن عربیؒ[1] (Ibn Arabi, d. 1840) کا سایہ ہے[2]۔

[1]۔ شیخ اکبر محی الدین محمد بن العربی الحاتمی الطائی الاندلسیؒ (1165ء-1240ء)، دنیائے اسلام کے ممتاز صوفی، عارف، محقق، قدوہ علما اور علوم کا بحر بیکنار رہیں۔ اسلامی تصوف میں آپؒ کو شیخ اکبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپؒ کا قول تھا کہ باطنی نور خود رہبری کرتا ہے۔ آپؒ کی تصانیف میں فصوص الحکم اور الفتوحات المکیہ بہت مشہور ہے اور کتب تصوف میں اس کا درجہ بہت بلند ہے۔

[2]۔ A History of Muslim Philosophy by M. M. Sharif, vol. 2, p.1338 - 40

۴

عہد جدید کے چیلنج

آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ زمانہ اول کے مسلمان اپنے عہد کے تمام چیلنجوں سے سرخرو ہوئے۔ انہوں نے انسانی فکر اور عمل کو آگے بڑھایا۔ زمانے کی قیادت کی لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ داستان کہتے کہتے سو گئے۔ زمانہ وسطیٰ اور عہد حاضر کے چیلنجوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ یورپ اور مغرب نے مسلمانوں کی علمی تحریک سے فائدہ اٹھایا اور پھر اسے آگے لے کر چلے۔ ویسے ہی جیسا کہ مسلمان یونان کی علمی تحریک کو آگے لے کر چلے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی قریب میں انسانی فکر و عمل نے کیا ترقی کی اور ہمارا ردعمل کیا تھا؟

1۔ سائنس

سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی میں نیوٹن (Newton, d. 1727) نے پرانی طبیعات کو یکسر بدل دیا جس سے حرکت کے نئے قوانین سامنے آئے اور سائنسی انقلاب کی بنیاد رکھی گئی۔ کاپرنیکس[1] (Copernicus, d. 1543) اور گیلیلیو (Galilio, d. 1645) نے نظام شمسی کے پرانے تصورات بدل دیئے۔ انجن کی ایجاد نے حیات انسانی کو نہ ختم ہونے والی حرکت عطا کی۔ پرنٹنگ پریس نے علم کو عالموں کے سینے سے نکال کر عوام تک پہنچایا۔ پنسلین جیسی دوائیوں نے

---

[1]۔ Nicolaus Copernicus؛ نکولس کاپرنیکس (1473ء-1543ء) ایک معروف ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا۔ اس نے پہلی دفعہ زمین کی بجائے سورج کا کائنات کے مرکز ہونے کا نظریہ پیش کیا۔

موت وحیات میں فاصلہ بڑھا دیا۔ تیر وتلوار کی جگہ الفریڈ نوبل[1](Alfred Nobel, d. 1896) کے بارود نے لے لی اور پھر ذرے کے دل کو چیر کر ایٹمی توانائی حاصل کر لی گئی۔ بادبانی کشتیوں کی جگہ دیو ہیکل جہازوں نے لے لی اور پھر ہوائی جہاز آ گئے۔

آپ افغانستان اور عراق کی جنگ کی مثالیں دیکھیں۔ تورا بورا[2] پر حملہ کرنے والے جہاز امریکہ سے اڑتے تھے اور بغیر راستہ میں رکے یہاں قیامت برساتے تھے۔ امریکہ میں لگے آلات قندھار میں ہونے والی طالبان کی گفتگو سن لیتے تھے۔ عراق کی پہلی جنگ میں امریکہ نے دجلہ وفرات کے پلوں کے صرف ان ستونوں پر بمباری کی جہاں مواصلاتی تار تھے۔ اس مہارت سے جیسا کہ دنیا کے سب سے اعلیٰ سرجن نے کوئی آپریشن نہایت مہارت سے کیا ہو۔

ہم یہاں دعا کرتے رہے کہ اللہ تعالیٰ کرے کہ امریکہ کے جہاز کالے کوے سے ٹکرا کر تباہ ہو جائیں اور ان کی توپوں میں کیڑے پڑ جائیں۔ ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا نظام ایک ضابطے سے چلتا ہے اور ہم یہ ضابطے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

مغرب نے وہی علم استعمال کیا جو ہم سے لیا تھا لیکن اس علم کو آگے بڑھایا اور ہم وہیں کے وہیں

---

[1]۔Alfred Bernhard Nobel؛ الفریڈ نوبل (1833ء-1896ء) سویڈن کا کیمیادان، انجینیئر، فوجی جنگی ساز و سامان تیار اور ڈیزائن کرنے والا اور ڈائنامائیٹ کا موجد تھا۔ نوبل انعام اسی کے نام سے موسوم ہے۔

[2]۔مشرقی افغانستان میں ایک پہاڑی سلسلے کا نام ہے۔ افغان امریکہ جنگ کے دوران اس پہاڑی سلسلہ پر امریکہ روزانہ کی بنیاد پر بمباری کرتا رہا۔

رہے۔مثال کے طور پر مدرسوں میں آج بھی اقلیدس[1] (Euclid, d. n.d.) کی کتاب ریاضی پڑھائی جاتی ہے۔ یہ کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی پہلے لکھی گئی تھی۔اس میں بہت تبدیلیاں ہوتی رہیں۔آج سے چند سال پہلے پاکستان میں ایف ایس سی میں ریاضی کی کتاب اس اقلیدس کی ترقی یافتہ شکل تھی۔جس سے طالب علم انجینئر بن جاتے ہیں۔لیکن مدارس کا فارغ التحصیل عالم سائنس سے ناواقف ہوتا ہے۔ہم ابھی تک پڑھاتے ہیں کہ دنیا میں عناصر اربعہ (four elements) یعنی آگ،مٹی، پانی اور ہوا ہے لیکن مغرب نے دیکھ بھال کر عناصر کی تعداد ایک سو دس کر دی اور ایک عنصر یورینیم کو چیرا اور ایٹم بم بنا لیا۔ہم عناصر اربعہ کے چکر میں ہیں۔ہم میں اور مغرب میں اتنا ہی فرق ہے جتنا 4 اور 110 میں ہے یا جتنا مٹی اور یورینیم میں ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر[2] (d. 1707) نصف صدی تک ہندوستان کا بادشاہ رہا۔اس کے پاس بہت وسائل تھے۔معروف معنوں میں دیندار تھا۔اس کا زمانہ وہ زمانہ ہے جس میں مغرب میں جدید

---

[1]۔Euclid؛ قلیدس ایک یونانی ریاضی دان تھا جو مصری شہر اسکندریہ میں تیسری صدی قبل مسیح میں رہا۔اس کی کتاب ایلیمنٹس (elements) ریاضی کی تاریخ کی مشہور ترین اور سب سے زیادہ دیر تک پڑھائی جانے والی نصابی کتاب ہے جو انیسویں اور بیسویں صدی تک پڑھائی جاتی رہی ہے۔

[2]۔سلطان اورنگزیب عالمگیرؒ (1618ء-1707ء) مغلیہ سلطنت کا بادشاہ اور شاہ جہاں کا بیٹا تھا۔جس نے 1658ء سے لے کر 1707ء تک ہندوستان پر حکومت کی۔عالمگیرؒ نے ہندوستان میں حکومتی سطح پر اسلامی شریعت کا احیا کیا جس کی وجہ سے آپؒ کو محی الدین کا خطاب دیا گیا۔فتاویٰ عالمگیری آپؒ کے دور کی شاہکار تخلیق ہے۔مغل بادشاہوں میں عالمگیرؒ واحد حافظ قرآن بادشاہ تھا۔

سائنس اور فلسفے کی ابتدا ہوئی۔ اس کے اثرات اس کی سلطنت تک پہنچ چکے تھے۔ واسکوڈے گاما[1] (Vasco da Gama, d. 1524) میں کالی کٹ میں اتر چکا تھا۔ اس نے اہل مغرب کو ایشیاء کا راستہ دکھا دیا تھا۔ 1510ء پر پرتگال نے ہندوستان کے ساحلی علاقے گوا پر قبضہ کرلیا تھا۔ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی جس نے بعد میں سراج الدولہ[2] (d. 1757) اور ٹیپو سلطان[3] (d. 1799) کو شکست دیکر ہندوستان پر سیاسی قبضے کی ابتدا کی، سولہویں صدی سے یہاں کام کررہی تھی۔ لیکن اورنگزیب (d. 1707) ان خطرناک سیاسی حقائق سے بالکل بے خبر رہا۔ 1620ء میں ہالینڈ (Holland) کے شہر ایمسٹرڈیم (Amsterdam) میں پرنٹنگ پریس (printing press) لگ چکا تھا۔ ہمارے ہاں بادشاہ سلامت اپنے متبرک ہاتھ سے قرآن مجید لکھنا کمال سمجھتے تھے۔ یورپ میں 1455ء میں انجیل مقدس پریس سے چھپ چکی تھی۔ اورنگ زیب (d. 1707) سے یہ بھی نہ ہوسکا کہ قرآن پاک کی اشاعت ہی کے لیے پرنٹنگ پریس لگوا لیتا۔ پیرس یونیورسٹی (Paris university) اور آکسفورڈ یونیورسٹی (Oxford university) گیارویں صدی میں بن چکی تھیں جبکہ اورنگزیب (d. 1707) نے یہ کام اٹھارویں صدی میں

---

[1]۔ Vasco da Gama: واسکوڈے گاما (1460ء - 1524ء) ایک پرتگالی بحری قزاق تھا جس نے جنوبی افریقہ کے گرد گھوم کر ہندوستان تک کا بحری راستہ دریافت کیا۔

[2]۔ مرزا محمد سراج الدولہ المعروف نواب سراج الدولہ (1733ء - 1757ء) بنگال، بہار اور اڑیسہ کے آخری آزاد حکمران تھے۔ 1757ء میں ان کی شکست سے بنگال میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کا سورج طلوع ہوا۔

[3]۔ ٹیپو سلطان (1750ء - 1799ء) ہندوستانی ریاست میسور کا اصلاح وحریت پسند حکمران تھا۔ ٹیپو سلطان نے برطانوی سامراج کے خلاف ایک مضبوط مزاحمت کی اور برصغیر کے لوگوں کو غیر ملکی تسلط سے آزاد کرنے کے لیے سنجیدہ و عملی اقدامات کئے۔

بھی نہ کیا[1]۔

جدید علوم سے یہ بے خبری تھی کہ 1857ء میں انگریز فوج کی تعداد صرف پینتالیس ہزار (45000) تھی جبکہ مسلمان فوج کی تعداد اڑہائی لاکھ تھی لیکن پھر بھی شکست ہمارا مقدر بنی۔ اس لیے ہم جدید علوم سے بے خبر تھے اور انگریز کے پاس توپ اور ٹیلی گرام (Telegram) تھے۔ ہم ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی میں اپنے پیغام کبوتر کے ذریعے بھیجتے تھے وہ ٹیلی گرام کی تاریں استعمال کرتے تھے۔ نتیجہ تو یہی نکلنا تھا جو نکلا[2]۔

2۔ جمہوریت

انسانی معاشرے کے ہیئت اجتماعی کے لیے مغرب نے شورائیت کے اصول کو اپنایا۔ برطانیہ کے شاندار انقلاب (Glorious Revolution, 1688) نے یہ اصول طے کر دیا کہ بادشاہوں کو غیر معمولی اختیارات نہیں ہیں بلکہ قانون کی حکمرانی زیادہ اہم ہے اور قانون عوام بناتی ہے۔ یہ طے ہو گیا کہ حکومت کرنا خدائی حق (divine right) نہیں ہے بلکہ اقتدار عوام کی ملکیت ہے۔ 1762ء میں فرانسیسی دانشور روسو[3] (Rousseau, d. 1778) نے اپنی مشہور زمانہ کتاب معاہدہ عمرانی (Social Contract) لکھی اور یہ تصور مغرب نے مان لیا کہ ریاست عمرانی معاہدہ

---

[1]۔ Encyclopedia of Britanica, Vol 7, p.761

[2]۔ فکر اسلامی از وحید الدین خان۔ صفحہ نمبر 180

[3]۔ Jean-jacques Rousseau؛ ژاں ژاک روسو (1712ء-1778ء) انسانی مساوات کا مبلغ اور ایک فلسفی تھا۔ جس کی تحریریں فرانس میں انقلاب برپا کرنے کا سبب بنیں۔

ہے۔عوام نے اپنے اختیارات حکمرانوں کو منتقل کیے ہیں تا کہ وہ امن و امان قائم کر سکیں۔

ہماری ساری سیاسی تعلیمات امیر کے اختیارات کے گرد گھومتی رہیں۔شوریٰ کو ہم نے امیر کے تابع کر دیا یہ کہہ کر کہ شوریٰ کو بھی امیر نامزد کرے گا۔ جب شوریٰ بھی نامزد اور اس کا فیصلہ بھی امیر کے لیے ماننا لازم نہیں تو پھر حکمران صدام حسین (d. 2006) نہیں بنیں گے تو اور کیا ہوگا۔

ہم ہی تو عوامی شورائیت کے علمبردار تھے۔اب ہم ہی اس کے خلاف ہو گئے۔جمہورت کی اصلاح کی بجائے اس کی مخالفت پر اپنی تمام توانائیاں خرچ کرنے لگے۔مسلم دنیا کی سیاسی حالت اب بھی فرانس کے انقلاب (French Revolution, 1779) سے پہلے کی ہے۔

3۔ حقوق انسانی

میگنا کارٹا[1] (Magna Carta, 1215) میں یہ طے ہو گیا تھا کہ عوام کے اپنے حقوق ہیں۔معاہدہ عمرانی کے تصورات نے اخوت، آزادی اور برابری کے اصولوں کو آگے بڑھایا۔فرانسیسی انقلاب (French Revolution, 1779) کے تصورات کے اصولوں آزادی (liberty)، مساوات (equity) اور اخوت (fraternity) نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

حقوق انسانی کی تحریک چلی۔عورتوں کو انسان سمجھا جانے لگا۔بچوں کے الگ حقوق طے ہونے

---

[1]۔میگنا کارٹا (Magna Carta) انسانی تاریخ کی ایک اہم قانونی دستاویز ہے جس میں برطانوی عوام کو بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ دیا گیا ہے۔یہ قانونی دستاویز جون 1215ء میں برطانوی عوام اور بادشاہ جان کے درمیان رنی میڈ کے مقام پر لکھی گئی۔

لگے۔ احترام انسانیت کا وہ تصور جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع میں دیا تھا وہ عملی طور پر راہنما بن گیا۔ سیاسی اور شخصی آزادیوں نے انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کو نکھرنے کا موقع دیا۔ انسان اپنی مرضی کا مالک بن گیا۔ قانون کی حکمرانی رواج پا گئی۔ آزادی اظہار نے عوام کی رائے کو وزن بخش دیا۔ جان و مال کی آبرو سے معاشرے میں امن و سلامتی رواج پانے لگی۔

حقوق انسانی کی تحریک نے عالمگیریت (universality) اختیار کر لی۔ ہم زمانہ وسطیٰ (middle ages) میں رہ گئے۔ عوام کو شہری کی بجائے محکوم سمجھتے رہے۔ قانون کا توڑنا عزت کی علامت بنا لیا۔ جان و مال حقیر شے سمجھتے رہے۔ عورتوں کو انسان سمجھنے کی بجائے شے (chattel) سمجھتے رہے۔

4۔ نئے سماجی علوم

انسان نے دیگر معاملات میں بھی حرکت کی، سائنسی و سیاسی ترقی نے نئے علوم جنم دیئے۔ فلسفہ امام غزالیؒ[1] (d. 1111) سے ہوتا ہوا ایمونیل کانٹ[2] (Immanual Kant, d. 1804) تک

[1]۔ ابوالحامد محمد بن محمد الغزالیؒ (1058ء-1111ء) اسلام کے نہایت مشہور مفکر، صوفی اور متکلم تھے۔ آپؒ کی کتابوں میں احیاء العلوم الدین ایک بلند پایہ تصنیف ہے جو کہ ہر دور میں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی رہی ہے۔ آپؒ کا شمار مجددین امت میں ہوتا ہے۔ آپؒ نے اسلامی شریعت وتصوف کو غیر ضروری فلسفہ سے پاک کیا۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپؒ نے فلسفہ کو دین بننے سے روکا۔

[2]۔ Immanuel Kant؛ ایمانویل کانت (1724ء-1804ء) ایک جرمن فلسفی اور مشہور ترین مفکر تھا۔ کانٹ نے فلسفے کی دنیا میں انقلاب پیدا کیا۔ وقت کی حاکم قوتوں کے بارے میں سوال پیدا کیے۔ عقل اور آزادی کو اپنی سوچ کا محور قرار دیا۔ اسکے خیالات اب بھی مستقبل کے لیے مشعل راہ ہیں۔

پہنچا۔عربوں کی تجربیت نے ڈیوڈ ھیوم[1] (David Hume, d. 1776) سے ہوتے ہوئے برٹرینڈ رسل[2] (Bertrand Russell, d. 1970) تک کا سفر طے کیا۔منطق (logic) ارسطو[3] (Aristotle, d. 322 BC) سے چل کر عہد حاضر میں زندگی کا حصہ بن گئی۔پچھلی چار صدیوں میں شاعری،افسانہ،ڈرامہ اور موسیقی نے کئی عروج دیکھے۔ہم امراءالقیس[4] پڑھاتے رہے۔ علم معاش نے ڈیوڈ ریکارڈو[5] (David Ricardo, d. 1823)،آدم سمتھ[6] (Adam Smith,

---

[1]۔David Hume؛ڈیوڈ ھیوم(1711ء-1776ء)ایک سکاٹش فلاسفر،تاریخ دان اور ماہر معاشیات تھا۔

[2]۔Bertrand Arthur William Russell؛برٹرینڈ آرتھر ولیمز رسل(1872ء-1970ء)ایک معروف محقق، مورّخ،سائنسدان، ماہر ریاضیات، ماہر طبیعیات، مدرّس اور فلسفی تھا۔1970ء میں یہ ادیب دنیا سے رخصت ہوگیا۔برٹرینڈ رسل کے علمی اور فلسفیانہ کاموں کی ایک طویل فہرست ہے۔فلسفہ،سائنس،تاریخ،سیاست،معاشرت،جنگ،امن،جنس،قانون اور انسانی ہمدردی پر برٹرینڈ رسل کی علمی اور تحقیقی کتب اور کتابچوں کی تعداد سینکڑوں میں پہنچتی ہے۔1950ء میں ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا، یہ واحد اعزاز تھا جو اُس نے قبول کیا۔ایٹمی سائنسدانوں کو انسانیت کا قاتل قرار دیا۔درازیٔ عمر کے باوصف رسل نے دمِ آخر تک اپنا وقت کارِقلم میں گزارا۔

[3]۔Aristotle؛ارسطو(322BC-384BC)یونان کا ممتاز فلسفی،مفکر اور ماہر منطق تھا،جس نے سقراط جیسے استاد کی صحبت پائی اور سکندر اعظم جیسے شاگرد سے دنیا کو متعارف کروایا۔

[4]۔Imra ul Qais bin Hujr al-kindi؛امراؤالقیس عہد جاہلیت کا ممتاز عرب شاعر تھا۔

[5]۔David Ricardo؛ڈیوڈ ریکارڈو(1772ء-1823ء)برطانوی ماہر معاشیات تھا۔

[6]۔Adam Smith؛جان آدم سمتھ(1723ء-1790ء)،ایک برطانوی ماہر معاشیات اور فلسفی تھا۔آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔گلاسگو یونیورسٹی میں فلسفے کا استاد رہا۔اس کی وجہ شہرت اس کی کتاب The Wealth of Nations ہے۔سمتھ نے سونے چاندی کی بجائے تعلیم یافتہ، ہنرمند اور محنتی افراد کو کسی ملک کی اصل دولت قرار دیا۔اس نے پرانے دور کی پابندیوں کی مخالفت کی جو کہ صنعتی انقلاب کی راہ میں رکاوٹ تھیں۔

(d. 1790 اور کارل مارکس[1] (Karl Marx, d. 1883) پیدا کیے جنہوں نے علم المعاش (Economics) بدل دیا۔ ہم آج تک ابوعبیدؒ کی کتاب الاموال[2] اور امام ابو یوسفؒ[3] (d. 798) کی کتاب الخراج پڑھاتے ہیں۔

5۔ عقلیت پسندی

سائنسی اور سماجی ترقی نے انسان کو اہمیت دی۔ عقل کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ عقل کو معیار حقیقت بنایا۔ عمومی رویوں کو غصے۔ جذبات اور توہمات (superstition) سے آزاد کیا۔ عقل سے عمومی حالات بہتر کرنے کی کوشش کی۔ ایک علمی اور عقلی ماحول بنا۔ ایک مزدور بھی اپنے گھر میں لائبریری بنانے لگا۔

ہم نے گہری نیند جاری رکھی۔ ہمارا فرض بنتا تھا کہ قرآنی فکر کو آگے بڑھاتے کہ عقل کا استعمال لازم ہے۔ تدبر و تفکر ایمان کا لازمہ ہے۔ عقل کو چراغ راہ بناتے۔ ہم نے خالصتاً غیر عقلی رویہ اختیار کیا۔ عقل کو گالیاں دیں۔ ایمان کو غیر ضروری طور پر عقل کے مقابل لا کھڑا کیا۔ اپنے علماء کی

---

[1]۔ Karl Marx؛ کارل مارکس (1818ء-1883ء) ایک مشہور فلاسفر، ماہر معاشیات، صحافی، سوشیالوجسٹ اور سوشلسٹ انقلابی تھا جس نے Das Kapital اور The Communist Manifesto جیسی شاہکار کتابیں لکھیں۔

[2]۔ کتاب الاموال امام ابوعبید قاسم بن سلام کی اقتصادیات کی دنیا میں ایک اہم کتاب ہے۔

[3]۔ امام ابو یوسفؒ (735ء -798ء) امام ابوحنیفہؒ کے جلیل القدر شاگرد اور حنفی مذہب کے ایک امام تھے۔ آپؒ کا اصل نام یعقوب بن ابراہیمؒ تھا۔ آپؒ تاریخ اسلام میں وہ پہلے شخص ہیں جن کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے خطاب سے نوازا گیا۔ آپؒ کی مشہور تصنیف کتاب الخراج فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

عصری تعبیروں (contemporary interpertations) کو اسلام سمجھ لیا حالانکہ وہ تعبیریں اس زمانے میں اسلام کی تفہیم تھیں۔ اسلام نہ تھیں۔ تعبیر کو بھی اصل متن (text) سمجھ لیا۔

6۔ معاشی ترقی

جمہوریت اور حقوق انسانی نے انسانی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ انسان کی تخلیقی صلاحیتیں انسان کی فلاح میں خرچ ہونے لگیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) کو جنم دیا۔ نقل وحمل (communications) کی ترقی سے بین الاقوامی تجارت میں بڑھوتری (growth) ہوئی۔ انسان دوست قوانین اور بینکوں نے معاشی ترقی کو آگے بڑھایا اور ہم دنیا کو مردار سمجھتے رہے۔

۵

موجودہ حالت

اس خوابِ غفلت کا وہی انجام ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ فطرت اپنے اصول نہیں بدلتی۔ اللہ تعالیٰ اس کائنات کو اپنے طے شدہ اصولوں (سنت) کے مطابق چلاتے ہیں اور سنت کبھی تبدیل نہیں ہوتی[1]۔

آیئے اس سوچ کے آئینے میں تھوڑی دیر کے لیے اپنا چہرہ دیکھ لیتے ہیں۔ ہمارا اسلام اقراء[2] (پڑھ) سے شروع ہوا تھا۔ ہم نے دنیا میں علمی تحریک کو جنم دیا تھا۔ مغرب کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) ہم نے عطا کی۔ حضرت اقبالؒ نے صحیح فرمایا ہے:

عہد نو با جلوہ ہا آراستہ
از غبار پائے ما برخاستہ[3]
(اس عہد کی چمک دمک ہمارے پاؤں کے غبار سے ہی ہے)

1۔ جہالت

آج ہم دنیا کی جاہل ترین ملت ہیں۔ تعلیمی معیار اور شرح خواندگی ہمارے سب سے کم ہے۔ جب مسلمانوں نے علمی مشاغل کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا، مغرب نے شمع علم کو آگے بڑھاتے

---

[1]۔ سورۃ الاحزاب: آیت: 62 (وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا)
[2]۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلی وحی میں سورۃ العلق کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں بار بار پڑھنے کا ذکر آیا ہے۔
[3]۔ اسرارِ خودی از محمد اقبالؒ

ہوئے پورے یورپ میں یونیورسٹیوں کا جال بچھا دیا۔ انھوں نے 300 سال سے کچھ زائد عرصے میں یونیورسٹی آف بولوگنا (University of Bologna, 1088)، یونیورسٹی آف پیرس، فرانس (University of Paris, 1150)، یونیورسٹی آف آکسفورڈ (University of Oxford, 1167)، یونیورسٹی آف کیمبرج (University of Cambridge, 1209)، یونیورسٹی آف سلامانکا، سپین (University of Salamanca, 1218)، یونیورسٹی آف مانٹپلائر، فرانس (University of Montpellier, 1220)، یونیورسٹی آف نیپلز (University of Naples, 1222)، یونیورسٹی آف تلوز، فرانس (University of Toulouse, 1229)، یونیورسٹی آف روم لا سیپانزے (University of Rome La Sapienze, 1303)، یونیورسٹی آف پیسا (University of Pisa, 1343)، یونیورسٹی آف ویانا (University of Vienna, 1365)، یونیورسٹی آف لپزنگ، جرمنی (University of Leipzing, Germany, 1409)، یونیورسٹی آف کاتانیا (University of Catania, 1434)، یونیورسٹی آف گلاسگو (University of Glasgow, 1451)، یونیورسٹی آف کوپن ہیگن (University of Copenhagen, 1479)، یونیورسٹی آف ایبرڈین (University of Aberdeen, 1494) میں قائم کر دیں۔ جبکہ یونیورسٹی آف پنجاب، پاکستان (University of Punjab, Pakistan, 1882) بھی ایک برطانوی مستشرق اور پادری جی ڈبلیو لٹنر (G.W. Leitner) نے قائم کی تھی۔

مسلمانوں میں شرح خواندگی کے حوالے سے درج ذیل حقائق محتاجِ توجہ ہیں:

(i) آج مسلمان دنیا میں تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ترین قوم ہیں۔

(ii) مسلم ممالک میں تعلیم کا معیار اور شرح خواندگی دنیا بھر سے کم ہے۔

(iii) دنیا میں اوسط شرحِ خواندگی 80 فیصد ہے جب کہ تنظیم اسلامی تعاون (OIC) کے مطابق ان ممالک میں اوسط شرح تعلیم بالغاں 72 فیصد ہے لیکن ذیلی صحرائی افریقہ اور جنوبی ایشیا میں یہ شرح مایوس کن حد تک کم ہے جو علی الترتیب 57 فیصد اور 55 فیصد ہے۔

(iv) تنظیم اسلامی تعاون (OIC) کے ممالک کی مجموعی ملکی پیداوار (GDP) کا اوسطاً 2.7 فیصد تعلیم عامہ پر خرچ ہوتا ہے جبکہ عالمی سطح پر اس کا اوسط 4 فیصد ہے۔

(v) اکیلے جاپان میں یونیورسٹیوں کی تعداد پوری مسلم دنیا کی یونیورسٹیوں سے زیادہ ہے۔ وہاں 778 قومی، پبلک اور نجی یونیورسٹیاں ہیں۔ پوری مسلم دنیا میں یونیورسٹیاں 600 سے کم ہیں جبکہ بھارت میں یونیورسٹیوں کی تعداد 8407 اور امریکہ میں 5758 ہیں۔

(vi) ہارورڈ یونیورسٹی کا سالانہ بجٹ بہت سے اسلامی ممالک میں تعلیم پر خرچ ہونے والے مجموعی بجٹ سے زیادہ ہے۔

(vii) آکسفورڈ یونیورسٹی ایک سال میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں 57 مسلم ممالک کی کل یونیورسٹیوں سے زیادہ تعداد میں جاری کرتی ہے۔

(viii) 6.1 بلین مسلمانوں میں سے 300,000 سے بھی کم افراد سائنسدان بنتے ہیں۔ یہ تناسب فی ملین مسلمانوں میں سے 230 بنتا ہے۔ امریکہ (USA) میں 1.1 ملین سائنسدان (4099 فی ملین) جب کہ جاپان میں 700,000 (5095 فی ملین) ہے۔

(ix) مسلمان ممالک اپنے کل GDPs کا بہت کم حصہ تعلیم پر خرچ کرتے ہیں۔ انڈونیشیا (3.6 فیصد) پاکستان (2.6 فیصد)، بنگلہ دیش (2.5 فیصد)، نائیجریا (3.4 فیصد) خرچ کرتا ہے۔

(x) تیونس واحد اسلامی ملک ہے جو اپنے کل GDP کا 7.2 فیصد تعلیم پر خرچ کرتا ہے۔ یہ GDP فیصد کے حساب سے ان ممالک سے زیادہ ہے۔ اسرائیل (6.3 فیصد)، فرانس (5.7 فیصد) اور برطانیہ (5.5 فیصد) سے زیادہ خرچ کر رہا ہے۔

(xi) تیونس اپنے GDP کا جو 7.2 فیصد تعلیم پر خرچ کر رہا ہے وہ امریکہ کے 5.9 بلین ڈالر کے مساوی ہے۔ جبکہ فرانس اپنے GDP کا 5.7 فیصد تعلیم پر خرچ کر رہا ہے۔ جو امریکہ کے 121.4 بلین ڈالر کے برابر ہے۔ یہ بات صاف ظاہر کرتی ہے کہ 'فیصد' ہرگز پوری کہانی نہیں سناتا۔ اس کیس میں فرانس تعلیمی شعبے میں تیونس سے 22 گنا زیادہ خرچ کر رہا ہے۔

(xii) 2008 کی اکیڈمک رینکنگ آف ورلڈ یونیورسٹیز (ARWU) کے مطابق فرانس کے پاس دنیا کی 500 ٹاپ یونیورسٹیوں میں سے 23 یونیورسٹیاں ہیں، ریپبلک آف کوریا کے پاس 8 اور اسرائیل کے پاس ایسی 6 یونیورسٹیاں ہیں جب کہ ترکی وہ واحد مسلمان ملک ہے جس کے پاس دنیا کی 500 ٹاپ یونیورسٹیوں میں سے ایک یونیورسٹی ہے۔

(xiii) عالمی یونیورسٹیوں کی 'دی ٹائمز ہائر ایجوکیشن رینکنگ' میں آٹھ مسلمان ممالک (ترکی، ملائشیا، انڈونیشیا، پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات) شامل ہیں۔ ان کے پاس 500 ورلڈ کلاس یونیورسٹیوں میں سے صرف 18 یونیورسٹیاں ہیں۔

(xiv) یونیسکو کے مطابق تیسرے درجے (ثانوی تعلیم کے بعد) کے علمی اداروں میں داخلے کی سب سے زیادہ شرح (53 فیصد) قازقستان میں ہے۔ جس کے بعد ایران اور ترکی (35 فیصد)، تیونس اور سعودی عرب (31 فیصد)، نائجر، برکینا فاسو اور افغانستان میں 2.5 فیصد سے کم ہے۔ جنوبی کوریا، برطانیہ، اسرائیل اور فرانس میں تیسرے درجے کی سطح میں داخلے کی شرح علی الترتیب 93 فیصد،

59 فیصد، 58 فیصد اور 56 فیصد ہے۔

(xv) بیشتر مسلم ممالک میں استاد شاگرد کا تناسب پرائمری سطح پر سب سے زیادہ ہے۔ مالی میں یہ تناسب 56 شاگرد فی استاد تک جا پہنچتا ہے۔ برکینا فاسو میں 46، گنی میں 45، نائجر میں 40، پاکستان اور سینیگال میں ایک استاد کے لئے 39 شاگرد ہیں۔ اس سے بالکل برعکس صورت حال یہ ہے کہ اسرائیل میں ایک استاد کے لئے 14 شاگرد (14:1)، برطانیہ اور فرانس میں یہ تناسب 18:1 ہے جب کہ جنوبی کوریا میں پرائمری سکول میں ہر استاد کو صرف 26 طلبا کو پڑھانا ہوتا ہے۔

افراد پر تعلیم کے اثرات اور ان کے کامیابی کے اعلیٰ ترین سطح پر پہنچنے کی ایک جھلک دیکھنی ہو تو آیئے ہم نوبیل پرائز جیتنے والوں میں مسلمانوں یا مسلم ممالک اور یہودیوں کے تناسب کا ملاحظہ کرتے ہیں:

مسلم دنیا سے نوبیل پرائز جیتنے والے افراد کی فہرست جن کی دنیا میں کل آبادی ایک ارب 60 کروڑ ہے۔ یعنی دنیا کی کل آبادی کا 23 فیصد	یہودی نوبیل پرائز یافتہ افراد کی فہرست جن کی دنیا میں کل آبادی ایک کروڑ 20 لاکھ ہے۔ یعنی دنیا کی کل آبادی کا 0.2 فیصد

ادب (Literature)

1988۔ نجیب محفوظ (Naguaib Mahfouz)	1910۔ پال ہیسی (Paul Heyse)
2006۔ ارحان پاموک (Orhan Pamuk)	1927۔ ہنری برگسان (Henri Bergson)
	1958۔ بورس پیٹرناک (Boris Pasternak)

1966۔سیموئل یوسف اگنن(Shmuel Yosef Agnon)

1966۔نیلی سیکس(Nelly Sachs)

1976۔ساؤل بیلو(Saul Bellow)

1978۔آئزک بشولیس سنگر(Issac Bashevis Singer)

1981۔الیاس کینیٹی(Elias Canetti)

1987۔جوزف براڈسکی(Joseph Brodsky)

1991۔ناڈین گاڈیمر(Nadine Gordimer)

2002۔ایمرے کرٹسز(Imre Kertesz)

2005۔ہیرالڈ پنٹر(Harold Pinter)

2014۔پیٹرک موڈیانو(Patrick Modiano)

امن (Peace)

1911۔الفریڈ فرائیڈ(Alfred Fried)

1911۔توبیاس اسر(Tobias Asser)

1968۔رینے کیسن(Rene Cassin)

1973۔ہنری کسنگر(Henry Kissinger)

1978۔انورالسادات (Anwar El-Sadat)

1994۔یاسر عرفات (Yasser Arafat)

2003۔شیریں عبادی (Shirin Ebadi)

2005۔محمد البرادی (Mohamed El-Baradei)

2006۔محمد یونس (Mohammed Yunus)

2011۔توکل کامران (Tawakel Kamran)

2014۔ملالہ یوسف زئی (Malala Yousafzai)

2015۔تیونسی قومی مذاکراتی ٹیم (Tunisian National Dialogue Quarter)

1978۔مناہم بیگن (Menachem Begin)

1986۔ایلی وائزل (Elie Wiesel)

1994۔شمعون پیریز (Shimon Peres)

1994۔یٹشیک رابین (Yitzhak Rabin)

1995۔جوزف روٹبلاک (Joseph Rotblat)

کیمیا (Chemistry)

1999۔احمد زیویل (Ahmed Zewail)

2015۔عزیز سنکار (Aziz Sancar)

1905۔اڈولف فان بائر (Adolph Von Baeyer)

1906۔ہنری موائسن (Henri Moissan)

1910۔اوٹو والاش (Otto Wallach)

1915۔رچرڈ ولسٹیٹر (Richard Willstaetter)

1918۔فرٹز ہیبر (Fritz Haber)

1943۔جارج چارلس ڈی ہیورسی

(George Charles de Hevesy)

1961۔میلوین کیلوین(Melvin Calvin)

1962۔میکس فرڈینٹڈ پروٹنز(Max Ferdinand Perutz)

1972۔ولیم ہاورڈ سٹین(William Howard Stein)

1972۔سی بی الفنسن (C. B. Anfinsen)

1977۔ایلیا پریگا جن(Ilya Prigogine)

1979۔ہربرٹ چارلس براؤن

(Herbert Charles Brown)

1980۔پال برگ(Paul Berg)

1980۔والٹر گلبرٹ(Walter Gilbert)

1981۔رونالڈ ہافمین(Ronald Hoffmann)

1982۔ہارون کلگ (Aaron Klug)

1985۔ہربرٹ اے ہاپٹمین

(Herbert A. Hauptman)

1985۔جیردم کارلے(Jerome Karle)

1986۔ڈڈلے آر ہرشباخ(Dudley R. Herschbach)

1988۔رابرٹ ہوبر(Robert Huber)

1989۔سڈنی آلٹمین(Sidney Altman)

1992۔روڈولف مارکس(Rudolph Marcus)

1998۔والٹرکوہن(Walter Kohn)

2000۔الن جے ہیگر(Alan J. Heeger)

2004۔اروین روز(Irwin Rose)

2004۔ہارون ہرشکو(Aaron Hershko)

2004۔ہارون سچانوور(Aaron Ciechanover)

2006۔راجرڈی کورنبرگ(Roger D. Kornberg)

2008۔مارٹن چلفائی(Martin Chalfie)

2009۔ادایوناتھ(Ada Yonath)

2011۔ڈین شیکٹمین(Dan Shechtman)

2012۔رابرٹ لیفکووٹز(Robert Lefkowitz)

2013۔ایرائی ورشل(Arieh Warshel)

2013۔مائیکل نیوبٹ(Michael Levitt)

2013۔مارٹن کارپلس(Martin Karplus)

اقتصادیات(Economics)

کوئی نہیں

1970۔پال انتھونی سیموئلسن

(Paul Anthony Samuelson)

1971۔سائمن کوزنیٹس(Simon Kuznets)

1972۔کینتھ جوزف آرو((Kenneth Joseph Arrow)

1973۔واسیلی لیونٹیف(Wassily Leontief)

1975۔لیونیڈ کینٹوروش(Leonid Kantorovich)

1976۔ملٹن فرائیڈ مین(Milton Friedman)

1978۔ہربرٹ اے سائمن(Herbert A. Simon)

1980۔لارنس رابرٹ کلین

(Lawrence Robert Klein)

1985۔فرانکو موڈگلیانی(Franco Modigliani)

1987۔رابرٹ ایم سولو(Robert M. Solow)

1990۔ہیری مارکووٹز(Herry Markowitz)

1990۔مرٹن ملر(Merton Miller)

1992۔گیری بیکر(Gary Becker)

1993۔رابرفوجل(Robert Fogel)

1994۔جوہن ہرسینی(Johan Harsanyi)

1994۔رینہارڈ سیلٹن(Reinhard Selten)

1997۔رابرٹ مارٹن(Robert Merton)

1997۔مائرن شولز(Myron Scholes)

2001۔جارج اکرلوف(George Akerlof)

2001۔جوزف سٹگلٹز(Joseph Stiglitz)

2002۔ڈینیل کاہنمین(Daniel Kahneman)

2004۔رچرڈ ایکسل(Richard Axel)

2005۔رابرٹ جے اومن(Robert J. Aumann)

2007۔لیونیڈ ہروکز(Leonid Hurwicz)

2007۔ایرک مسکن(Eric Maskin)

2007۔راجر مائرسن(Roger Myerson)

2008۔پال کرگمین(Paul Krugman)

2010۔پیٹر ڈائمنڈ(Peter Diamond)

2012۔ایلوین ای روتھ(Alvin E. Roth)

فزیالوجی/میڈیسن (Physiology/Medicine)

کوئی نہیں

1908۔ایلی میچنیکوف(Eli Metchnikoff)

1908۔پال ایرلک(Paul Erlich)

1914۔رابرٹ برینی(Robert Barany)

1922۔اوٹو میر ہوف(Otto Meyerhof)

1930۔کارل لینڈسٹینر(Karl Landsteiner)

1931۔اوٹو واربروگ(Otto Warbrug)

1936۔اوٹو لووی(Otto Loewi)

1944۔جوزف ارلینگر(Joseph Erlanger)

1944۔ ہربرٹ سپنسر گیسر(Herbert Spencer Gasser)

1945۔ ارنسٹ بورس چین(Ernst Boris Chain)

1946۔ ہرمن جوزف مُلر(Herman Joseph Muller)

1947۔ گیرٹی کوری(Garty Cori)

1950۔ ٹیڈیس ریشسٹین(Tadeus Reichstein)

1952۔ سلمان ابرہام وکسمین

(Selman Abraham Waksman)

1953۔ ہینس کربس(Hans Krebs)

1953۔ فرٹز البرٹ لپمین(Fritz Albert Lipmann)

1958۔ جوشوا لیڈر برگ(Joshua Lederberg)

1959۔ آرتھر کورنبرگ(Arthur Kornberg)

1964۔ کونراڈ بلوچ(Konrad Baloch)

1965۔ فرینکوائس جیکب(Francois Jacob)

1965۔ آندرے لووف(Andre Lwoff)

1967۔ جارج ویلڈ(George Wald)

1968۔ مارشل ڈبلیو نرنبرگ(Marshall W. Nirenberg)

1969۔ سلواڈور لوریا(Salvador Luria)

1970۔ جولیئس ایکسلراڈ(Julius Axelrod)

1970۔ سر برنارڈ کاٹز(Sir Bernard Katz)

1972۔ جیرالڈ ماریس ایڈلمین

(Gerald Maurice Edelman)

1975۔ ڈیوڈ بالیٹمور(David Balimore)

1975۔ ہاورڈ مارٹن ٹیمین(Howard Martin Temin)

1976۔ براخ ایس بلمبرگ(Baruch S. Blumberg)

1977۔ روزالین سسمین ییلو

(Rosalyn Sussman Yellow)

1977۔ اینڈریووی شیلی(Andrew V. Schally)

1978۔ ڈینیل نتھانس(Daniel Nathans)

1980۔ بروج بیناسرآف(Baruj Benacerraf)

1982۔ سرجان وینی(Sir John Van)

1984۔ سیزر ملسٹین(Cesar Milstein)

1985۔ مائیکل سٹوارٹ براؤن

(Michael Stuart Brown)

1985۔ جوزف ایل گولڈسٹین(Joseph L. Goldstein)

1986۔ ریٹالیوی مونٹالسینی (Rita Levi Montalcini)

1986۔ سٹینلے کوہن(Stanley Cohen)

1988۔ جرٹروڈ ایلین(Gertrude Elion)

1989۔ ہیرالڈ ورمس(Harold Varmus)

1991۔ ایروین نیہر(Erwin Neher)

1991۔برٹ سکمان(Bert Sakmann)

1992۔ایڈمنڈ فشر(Edmond Fischer)

1993۔رچرڈ جے رابرٹس(Richard J. Roberts)

1994۔فلپ شارپ(Phillip Sharp)

1994۔الفریڈ گلمین(Alfred Gilman)

1994۔مارٹن روڈبیل(Martin Rodbell)

1995۔ایڈورڈ بی۔لیوس(Edward B. Lewis)

1997۔سٹینلے بی۔پروزینر(Stanley B. Prusiner)

1998۔رابرٹ ایف۔فرشگاٹ(Robert F. Furchgott)

2000۔ایرک آر۔کینڈل(Eric R. Kandel)

2000۔پال گرینگارڈ(Paul Greengard)

2002۔سڈنی برینر(Sydney Brenner)

2002۔رابرٹ ایچ۔ہورونز(Robert H. Horvitz)

2004۔رچرڈ ایکسل(Richard Axel)

2006۔اینڈریو فائر(Andrew Fire)

2011۔رالف ایم سٹنمین(Ralph M. Steinman)

2011۔بروس بیوٹلر(Bruce Beutler)

2013۔جیمز ای۔روتھمین(James E. Rothman)

2013۔رینڈی شکمین(Randy Schekman)

طبیعیات (Physics)

1979 ۔عبدالسلام
(Abdus Salam)

1907۔البرٹ ابراہام مشلسن
(Albert Abraham Michelson)

1908۔گیبرائل لپمین(Gabriel Lippmann)

1921۔البرٹ آئن سٹائن(Albert Einstein)

1922۔نائلس بوہر(Niels Borh)

1925۔جیمز فرینک(James Franck)

1925۔گستاف ہرٹز(Gustav Hertz)

1943۔گستاف سٹرن(Gustav Stern)

1944۔ایسوڈور آئزک ربی(Isidor Issac Rabi)

1945۔وولف گینگ پالی(Wolf Pauli)

1952۔فلیکس بلوچ(Felix Bloch)

1954۔میکس بارن(Max Born)

1958۔ایگورٹم(Igor Yevgenyevich)

1958۔الجامیخائیلووچ(Il'ja Mikhailovich)

1958۔ایگور یوجینی وچ(Igor Yevgenyevich)

1959۔ایمیلیو سگرے(Emilio Segre)

1960۔ڈونلڈ اے گلیزر(Donald A. Glaser)

1961۔رابرٹ ہافسٹیڈٹر(Robert Hofstadter)

1962۔لیوڈیوڈوویچ لنڈا(Lev Davidovich Landau)

1963۔یوجین پی وگنر(Eugene P. Wigner)

1965۔رچرڈ فلپس فینمیں

(Richard Phillips Feynman)

1965۔جولین شونگر(Julian Schwinger)

1967۔ہنیز البرخت بیتھی(Hans Albrecht Bethe)

1969۔مرے جیل مین(Murray Gell Mann)

1971۔ڈینس گیبر(Dennis Gabor)

1972۔لیون این کوپر(Leon N. Cooper)

1973۔برہان ڈیوڈ جوزفسن

(Brain David Josephson)

1975۔بنجمین موٹلسن(Benjamin Mottleson)

1976۔برٹن رکٹر(Burton Richter)

1978۔ارنو ایلن پینز یاس(Arno Allan Penzias)

1978۔پیٹر ایل کپٹزا(Peter L. Kapitza)

1979۔سٹیفن وینبرگ(Stephen Weinberg)

1979۔شیلڈن گلاشو(Sheldon Glashow)

1988۔لیون لیڈرمین(Leon Lederman)

1988۔میلوین شوارٹز(Melvin Schwartz)

1988۔جیک سٹینبرگ(Jack Steinberger)

1990۔جیروم فرائیڈ مین(Jerome Friedman)

1992۔جارجز چر پک(Georges Charpak)

1995۔مارٹن پرل(Martin Perl)

1995۔فریڈرک ریز(Frederick Reines)

1996۔ڈیوڈ ایم لی(David M. Lee)

1996۔ڈگلس ڈی اوشروف(Douglas D. Osheroff)

1997۔کلاڈ کوہن ٹنوجی

(Claude Cohen-Tannoudji)

2000۔زہوریز آئی۔الفروف(Zhores I. Alferov)

2003۔ویٹالی جنز برگ(Vitaly Ginsburg)

2003۔الیکسی ابریکوسوف(Alexei Abrikosov)

2004۔ڈیوڈ گراس(David Gross)

2004۔ایچ ڈیوڈ پولٹزر(H. David Politzer)

2005۔رائے گلابر(Roy Glauber)

2011۔ایڈم رائس(Adam Riess)

2011۔سادل پرلیمٹر(Saul Perlmutter)

2012۔سرج ہیروشے(Serge Haroche)

2013۔فرینکوائس اینگلرٹ(Francois Englert)

نوبیل پرائز ایک سالانہ بین الاقوامی انعام ہے جو سب سے پہلے 1901ء میں فزکس، کیمسٹری، فزیالوجی، میڈیسن، لٹریچر اور امن کے سلسلے میں بہترین کارناموں پر دیا گیا تھا۔ اکنامکس پر یہ 1969ء سے دیا جارہا ہے۔ نوبیل انعامات 850 سے زائد افراد کو دیا گیا ہے۔ ان میں سے کم سے کم 20 فیصد یہودی ہیں باوجود اس حقیقت کے کہ وہ دنیا کی کل آبادی کا 0.2 فیصد سے بھی کم ہیں۔ مجموعی طور پر انھوں نے اکنامکس میں 41 فیصد، میڈیسن میں 28 فیصد، فزکس میں 26 فیصد، کیمسٹری میں 19 فیصد، لٹریچر میں 13 فیصد اور شعبۂ امن میں یہ انعامات حاصل کئے۔ یہودیوں نے چھ کے چھ زمروں میں یہ انعامات پائے۔ دوسری جانب ایک پاکستانی عبدالسلام نے فزکس میں یہ انعام پایا۔ اس کا تعلق قادیانی / احمدی فرقے سے تھا۔ احمد زیول (مصر) اور عزیز سنکر (ترکی)، مسلم دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر انھوں نے تعلیم اور تحقیق کا کام امریکہ میں کیا ہے۔ مزید برآں دیگر نوبیل انعام یافتہ مسلمان عامۃ المسلمین کی نظر میں غیر عملی قسم کے مسلمان ہیں۔

2۔ غربت

ہماری معاشی حالت نا قابل بیان ہیں۔ تمام مسلمان ممالک بشمول سعودی عرب (جہاں بے پناہ تیل ہے) کی سالانہ قومی آمدنی جاپان سے بھی کم ہے۔ وہ جاپان جس کی زمین نہیں۔ جس میں تیل نہیں بلکہ صرف اور صرف ٹیکنالوجی ہے۔

ہماری اوسط عمر 50 سال ہے اور جاپان کی 80 سال۔ انہوں نے سائنس سے موت کو دھکیل دیا ہے۔ ہم سنت کے مطابق علاج کیے بغیر موت کو اللہ تعالیٰ کی مرضی سمجھ لیتے ہیں۔

3۔ عسکری بے بسی

ہمیں حکم تھا کہ دشمن کے لیے پوری استطاعت سے تیاری کرو[1]۔ صورت حال یہ ہے کہ ہم دنیا کی کمزور ترین ملت ہیں۔ افغانستان کا حشر دیکھ لیں۔ وہاں تو بہت سے مسلمانوں کے بقول اسلام کی خالص حکومت تھی۔ کیا حشر ہوا۔ جا کر تورا بورا کو دیکھیں۔ پہاڑ فنا ہو گئے ہیں۔

عراق میں آپ کے کچھ مقدس ترین مقامات ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مزار ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مزار ہے۔ حضرت ابو حنیفہؒ (d. 772) کا مزار ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ[2] (d. 1166) کا مزار ہے۔ وہ دیس امریکی بوٹوں کے نیچے رہا ہے۔ عراق کی جنگ میں تمام مسلمان ممالک نے صرف زبانی مخالفت کی۔ او آئی سی[3] (OIC) نے قراردادیں پاس کیں لیکن بے بسی دیکھیں کہ اپنی سرزمین امریکیوں کو دی کہ عراق پر حملے کے لیے استعمال کر لے۔

---

[1]۔ سورۃ الانفال: آیت: 60 وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (تم سے جس قدر ہو سکے اِن کے لیے فوج اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو جس سے اللہ کے دشمنوں پر اور تمھارے اِن دشمنوں پر تمھاری ہیبت رہے اور اِن کے علاوہ دوسروں پر بھی جنھیں تم نہیں جانتے ہو، اللہ اُنھیں جانتا ہے)

[2]۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (1077ء-1166ء) نہایت اہم صوفی شیخ اور سلسلہ قادریہ کے بانی ہیں۔ آپؒ کا مزار عراق کے شہر بغداد میں ہے۔

[3]۔ Organisation of Islamic Cooperation؛ تنظیم تعاون اسلامی ایک بین الاقوامی تنظیم ہے جس میں مشرق وسطی، شمالی، مغربی اور جنوبی افریقا، وسط ایشیا، یورپ، جنوب مشرقی ایشیا اور برصغیر اور جنوبی امریکا کے 57 مسلم اکثریتی ممالک شامل ہیں۔ او آئی سی کا مقصد دنیا بھر کے 1.2 ارب مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے کام کرنا ہے۔

4۔ سیاسی جبر

اپنا سیاسی نظام دیکھیں۔ کسی ایک مسلمان ملک میں بھی مکمل شورائی حکومت نہیں ہے۔ آج سے چند سال پہلے افغانستان میں طالبان کی حکومت تھی۔ وہ عالم دین تھے۔ مکمل کنٹرول تھا۔ کوئی مشکل نہ تھی۔ اپنے حساب سے خالص اسلام نافذ کیا۔ اسلام کے نام پر بہت سے لوگوں سے سختی کی گئی۔

طالبان کو شوق ہوا کہ صوبہ بامیان میں بدھ مت کے ہزاروں سال سے موجود مذہبی و تاریخی آثار (monuments) ختم کریں۔ پوری دنیا نے شور و واویلا کیا۔ کسی کی ایک نہ سنی۔ یہ تک نہ سوچا کہ افغانستان حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتح ہوا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خانہ کعبہ کے بت گرانے والوں میں شامل تھے۔ انہوں نے بدھ مت کے ان آثار کو نہیں گرایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے گرایا۔ محمود غزنویؒ[1] (d. 1030) جسے ہم بت شکن کہتے ہیں۔ وہ ان بتوں کے پہلو میں پیدا ہوا۔ وہ ہزاروں میل دور سومنات[2] (ہندوستان) میں جا کر بت توڑتا رہا لیکن اپنے قرب و جوار میں ان بتوں کو برداشت کرتا رہا۔

طالبان کے اسلام میں عقل (reason) نہ تھی۔ تاریخ کا احساس نہ تھا۔ اقلیتوں کے حقوق نہ تھے۔ انہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کا اندازہ نہ تھا۔ ان کا اسلام کھنڈروں اور غاروں کے زمانے کا

۱۔ یمین الدولہ ابو القاسم محمود ابن سبکتگین المعروف سلطان محمود غزنویؒ (971ء-1030ء) سلطنت غزنویہ کا حکمران تھا جو 997ء سے لے کر اپنی وفات 1030ء تک برسراقتدار رہا۔ اس کی وسیع سلطنت میں موجودہ مکمل افغانستان، ایران اور پاکستان کے کئی حصے اور شمال مغربی بھارت شامل تھا۔ وہ تاریخ اسلامیہ کا پہلا حکمران تھا جس نے اپنے لیے سلطان کا لقب اختیار کیا۔

۲۔ سومناتھ یا سومنات ہندوستان کے صوبہ گجرات کے مغربی ساحل پر واقع ایک شہر ہے۔ اس شہر کی وجہ شہرت وہاں پر موجود سومناتھ مندر یا سومنات مندر کی وجہ سے ہے۔

اسلام تھا۔ اسی لیے تورابورا کے غاروں میں دفن ہو گیا لیکن امت مسلمہ پر قیامت برپا کر گیا۔

ہمارے ہاں اتنے سیاسی جبر اور بے عقلی کے باوجود عوامی حاکمیت کے لیے مناسب علمی یا سیاسی تحریکیں نہیں ہیں۔ تبدیلی کی خواہشمند جماعتیں بھی شخصی، خاندانی یا فرقہ پرست ہیں۔ جن کے سیاسی نظریات ملوکیت (kingship) والے ہیں۔

قافلۂ حجاز میں ایک حسین رضی اللہ عنہ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات[1]

5۔ دین کی غلط تعبیر

مسلمان ذاتوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ اصل دین اس کے پاس ہے اور باقی سب کافر ہیں۔ حتیٰ کہ دوسرے فرقوں کے خلاف قتل و غارت کو بھی ثواب سمجھا جاتا ہے۔ جہاد سمجھا جاتا ہے۔

جہاد جو اصلاح نفس اور اصلاح معاشرہ کا ایک خوبصورت ذریعہ تھا۔ وہ قتل و غارت کا آلہ کار بن گیا۔ 1998ء کے رمضان شریف کی ایک صبح آج بھی مجھے پوری طرح یاد ہے۔ میں اس وقت پنجاب کے ضلع مظفر گڑھ میں تعینات تھا۔ میں سحری کر کے لیٹا ہی تھا کہ مجھے پولیس وائرلیس نے پیغام دیا کہ تھانہ قریشی (مظفر گڑھ) کی ایک مسجد پر فائرنگ ہوئی ہے۔ کچھ لوگ مارے گئے ہیں۔ میں اور ایس پی صاحب منہ اندھیرے مسجد میں پہنچے۔ لوگ بہت مشتعل تھے۔ بہت مشکل سے مسجد میں داخل ہوئے۔ ایک چھوٹی سی مسجد میں کچھ لوگ صبح کی نماز کے بعد قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ کچھ ظالم لوگ آئے۔ اپنے تئیں جذبہ جہاد سے سرشار تھے۔ انہوں نے گولیاں

---

[1]۔ ذوق وشوق؛ بال جبریل از محمد اقبالؒ

چلائیں۔سترہ (17) لاشیں چھوڑ گئے۔ میں نے دیکھا کہ مسجد کا کمرہ لاشوں سے بھرا پڑا ہے۔ مسجد میں خون ہی خون ہے۔قرآن پاک گولیوں سے چھلنی ہیں۔ وہ نیک لوگ تھے۔سحری کے بعد مسجد میں تھے۔قرآن پاک پڑھ رہے تھے۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ ان کا تعلق ایک خاص فقہی مسلک سے تھا۔

یہ کیوں ہوا؟ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی شرم نہیں کہ اسلام سے غافل علما کی شعلہ بیانیوں سے ہوا۔ میں نے ملازمت کے دوران بارہا علما کرام سے دوسرے فرقے کے لوگوں کو قتل کرنے کے فضائل سنے ہیں۔گھنٹوں میں نے علما سے بحث کی۔ ان کو سمجھایا کہ نہیں سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے لیکن مجال کہ وہ میری گزارشات سنتے۔بس ان کے منہ پر ایک ہی لفظ ہوتا کہ وہ کافر ہیں۔ جہاد کی غلط تعبیر سے مذہبی فرقہ واریت بڑھ گئی ہے۔ جوانوں کا خون بہہ رہا ہے اور عالمی سطح پر اسلام کا امیج (image) خراب ہو گیا ہے۔

معاشی معاملات میں بھی ہماری سوچ صحیح نہیں ہے۔ ہماری معاشی فکر پر جاگیرداری (feudalism) اور سرمایہ داری (capitalism) کا غلبہ ہے۔جنرل ایوب خان[1] (d. 1974) اور ذوالفقار علی بھٹو[2] (d. 1979) نے پاکستان میں زرعی اصلاحات (land reforms) نافذ کیں۔جس سے یہ طے کیا گیا کہ کوئی بھی آدمی ایک خاص حد سے زیادہ زمین اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔حکومت اس حد سے زیادہ زمین اس شخص سے لے کر ان لوگوں کے حوالے کر دے گی جو اس وقت اس زمین کو کاشت کر رہے ہوں گے۔ سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بینچ نے ان

---

[1]۔محمد ایوب خان (1907ء-1974ء) پاکستان کے سابق صدر، فیلڈ مارشل اور سیاسی راہ نما تھے۔

[2]۔ذوالفقار علی بھٹو (1928ء-1979ء) پاکستان کے وزیر خارجہ، صدر، پہلے منتخب وزیر اعظم، پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی، آئین پاکستان (1973ء) کے خالق اور ایک دور اندیش اور منجھے ہوئے سیاست دان تھے۔

اصلاحات کوقزلباش کیس میں غیر اسلامی قرار دے دیا[1] اور جاگرداری کے حق میں ایسی دلیلیں استعمال کی گئیں جس سے مسلمانوں کے عہداول کے قائدین کی توہین ہوتی ہے۔

صرف فرقہ پرستی ہی نہیں بلکہ جہالت، غربت، سیاسی جبر اور عسکری بے بسی بھی دین کی غلط تعبیر کا نتیجہ ہے۔ ہم نے اسلام کوتو ہم پرستی اور دنیا سے بیزاری کا مذہب بنا دیا ہے حالانکہ اسلام ایک ترقی یافتہ اور سائنسی دین ہے جو ایک شاندار تہذیب بناتا ہے۔ ہمارا اسلام مسکنت (poverty) کا مذہب بن گیا ہے۔ موجودہ تعبیر کا فطری نتیجہ وہ ذلت ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر جہالت، غربت، عسکری بے بسی، سیاسی جبر اور فرقہ واریت جاری رہے گی تو ذلت مقدر رہے گی۔ حضرت اقبالؒ صحیح فرماتے ہیں:

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات[2]

۱۔ PLD 1990 SC. 99

۲۔ ابوالعلامعری؛ بال جبریل از محمد اقبالؒ

٦
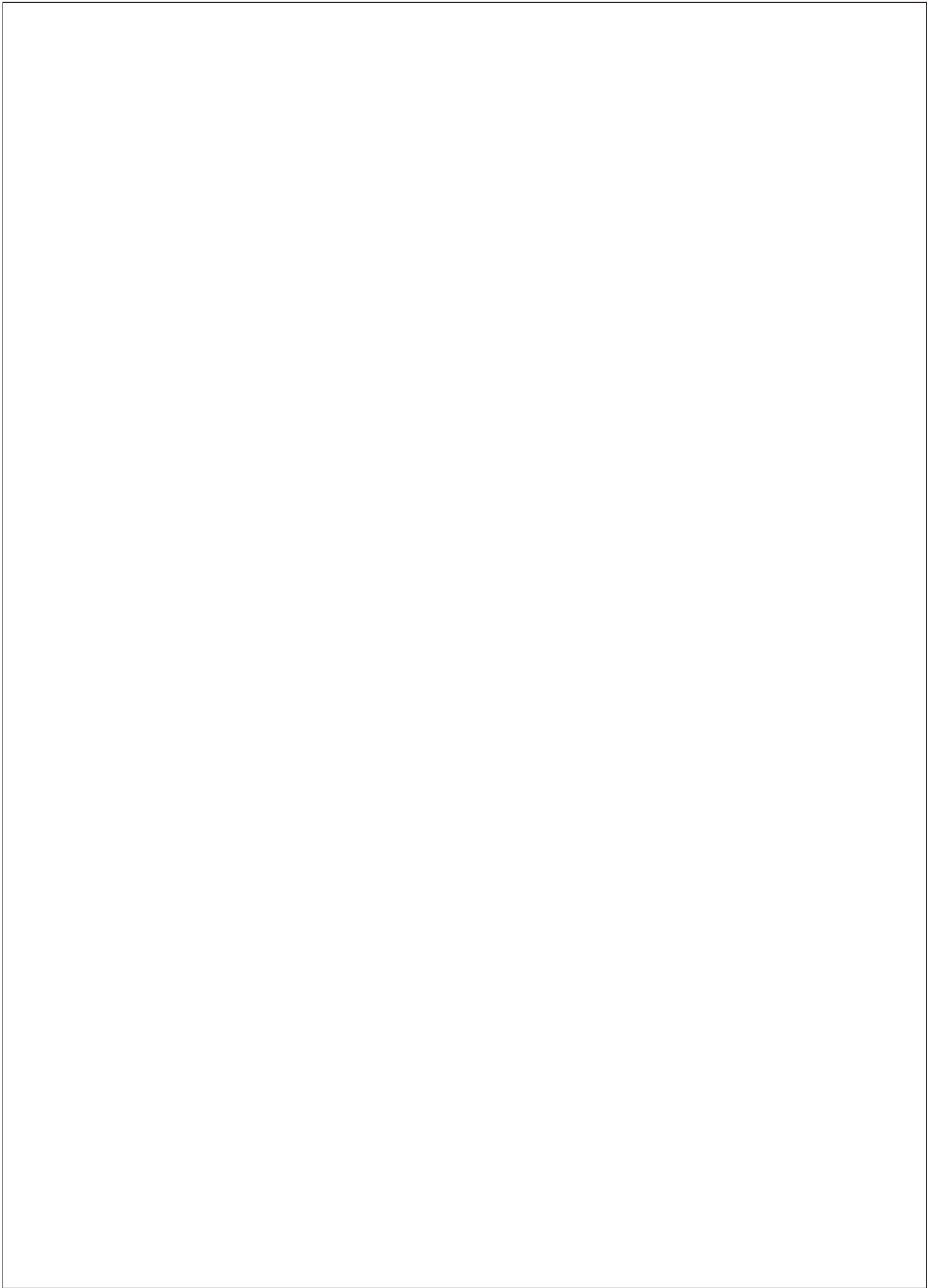
لائحہ عمل

ہم عام طور پر دنیا کی کم پڑھی لکھی قوموں میں سے ایک ہیں۔ سیاسی نظام ابھی تک ملوکیت والا ہے۔عسکری لحاظ سے مغلوب ہیں۔ معاشی لحاظ سے مفلوک (poor) ہیں۔سماجی لحاظ سے پست ہیں۔ انسانی حقوق کا احترام نہیں۔قانون کی حکمرانی کی پرواہ نہیں۔فرقہ بندی ہے اور کہیں ذاتیں ہیں۔ ہماری حالت کا بیان اس شعر سے بہتر نہیں ہوسکتا۔

اک چاک ہوتو سی لوں یارب میں اپنا دامن
ظالم نے پھاڑ ڈالا ہے تار تار کر کے

اگر ہم نے اپنی حالت صحیح کرنے کی کوشش کرنی ہے تو ہمیں دیکھنا ہے کہ مسئلہ کیا ہے اور کہاں کہاں بہتری ہوسکتی ہے؟ اس لیے چند پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اسے اسلام دشمنی نہ سمجھیے گا بلکہ عاجزانہ گزارشات گردانیے گا۔

1۔ اصل تعلیمات کی دعوت

(i) صحیح نظریہ

اسلام ایک واضح و الگ فکری نظام رکھتا ہے۔جس کی روشنی میں زندگی کی ایک خاص نہج (way) بنتی ہے۔ اسلام کے مطابق یہ کائنات بے معنی (meaningless) نہیں ہے۔ باطل (purposless) نہیں ہے بلکہ اپنے اندر گہرے معنی رکھتی ہے۔اس کی ایک ابتدا ہے اور ایک واضح انتہا ہے۔اس کی تخلیق ہوئی ہے۔اس کا ایک بادشاہ ہے۔کائنات اس کے تابع ہے۔انسان اس نظام کائنات کا دلہا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ولی عہد (vicegerent) ہے۔جس طرح نظام کائنات

ایک ضابطہ کے تحت چل رہا ہے ویسے ہی انسان کے لیے ایک ضابطہ حیات ہے۔ ہدایت ہے۔ اگر وہ اس پر چلے گا تو ہدایت پائے گا نہ اسے کوئی مستقبل کا خوف ہو اور نہ ہی اسے ماضی کا غم۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ[1]

(پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے پس جو میری ہدایت پر چلیں گے ان پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے)

اس بنیادی خاکہ (paradigm) کے اندر انسان اپنی صلاحیتوں کو تخلیقی عمل دے سکتا ہے بلکہ ایسا کرنا لازم ہے۔ یہ زندگی ایک نئی شکل لے گی اور پھر انسان کی جواب دہی ہوگی۔ اگر زندگی میں انسان نے ہدایت پر عمل کیا تو دنیا و آخرت میں فلاح پائے گا اور اگر یہاں ہدایت سے بے نیازی برتی اور اپنے خالق سے بغاوت کی تو پھر ذلت اس کا مقدر ہوگی۔ یہاں مادی ترقی عام طور پر محنت سے ملتی ہے بلکہ اسباب دنیا کی کثرت عزت کی علامت نہیں ہے۔ انسان آزمائش میں ہے۔ حیات و موت کی تخلیق آزمائش ہے کہ انسان کیسے اعمال کرتا ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ[2]

(اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرنے والا ہے اور وہ زبردست، درگزر فرمانے والا ہے)

یہ وہ نظریہ حیات ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت اس سے غافل ہے۔ ہم کئی طبقات میں تقسیم ہیں۔ کچھ لوگ اس حیات و کائنات کو بے مقصد سمجھتے ہیں۔ اپنی ذاتی و اجتماعی

۱۔ سورۃ البقرہ: آیت: 38

۲۔ سورۃ الملک: آیت: 2

زندگی میں خدا کے دخل کو نہیں مانتے۔ اپنی عقل سے اوپر کوئی ہدایت نہیں سمجھتے۔ اپنے آپ کو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتے۔ عام طور پر ہمارے صاحب دولت اور صاحب اقتدار لوگ اس فکر میں گم ہیں۔ اعلیٰ اخلاق ان کا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ زندگی ایک بار ملی ہے۔ عیش کرنا چاہیے۔

نو روز و نو بہار و مے و دلبرے خوش است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست
(نوروز ہے، بہار کی نوخیزیاں ہیں، شراب ہے اور پیارا سا محبوب ہے)
(بابر، عیش میں سرگرم ہو جا کہ دنیا دوبارہ نہیں ملنے والی)

ہم میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کئی خداؤں پر یقین رکھتے ہیں۔ جائیداد بھی خدا ہے۔ اقتدار بھی خدا ہے۔ پیر بھی خدا ہے۔ وڈیرا بھی خدا ہے۔ عجیب رسم و رواج پائے جاتے ہیں۔ نہ کوئی واضح ہدایت ہے نہ کوئی واضح عمل۔ کئی خدا اور کئی اخلاق۔ اکثر غریب لوگ اس فکر کے زیر اثر ہیں۔

تیسرا گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو اس دنیا کو عذاب (ordeal) سمجھتا ہے۔ روح کو قیدی سمجھتا ہے۔ انسانی خواہشات کو گناہ سمجھتا ہے۔ ریاضت کے نام پر اپنے جسم کو تکلیف دیتا ہے۔ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔ دنیا کو ترک کر کے الگ بیٹھ جاتا ہے۔ غلط قسم کی قسمت پرستی (fatalism) میں مبتلا ہے۔ دین و دنیا میں تقسیم کی جاتی ہے۔ ایمان بچانے کے لیے دنیاوی معاملات ترک کر دیئے جاتے ہیں۔ دین کی انقلابی تعلیمات کی بجائے کشف و کرامات (revelation and miracles) میں مست رہتے ہیں۔ عام مذہبی لوگ اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہمارا لائحہ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ہم دین کی صحیح تفہیم (understanding) کریں۔ نظریہ حیات واضح

کریں۔ ازسرِنو غور کریں کہ دین ہم سے کیا تقاضا کرتا ہے؟ اس کائنات میں ہماری پوزیشن کیا ہے؟ ہمارے اعمال کا کیا مقام ہے؟ ہمارا اخلاق کیسا ہونا چاہیے؟ اسلامی فکر کو جس کا پہلے ذکر کیا گیا ہے، اپنے اندر جذب کریں اور فکری لحاظ سے باشعور اور عملی لحاظ سے ذمہ دار فرد بنیں۔ اپنی ذاتی صلاحیتوں کو بھرپور طریقے سے استعمال کرتے ہوئے اجتماعی فلاح کے لیے صرف کریں۔ انسانی خدمت میں اللہ تعالیٰ کی رضا ڈھونڈیں۔ دنیاوی کاموں میں مصروف ہوتے ہوئے بھی دل کو اللہ تعالیٰ سے جوڑے رہیں۔ یعنی کہ جلوت میں خلوت پائیں۔

(ii) بنیادی تعلیمات

عام طور پر اہل اسلام کی تمام گفتگو کا مرکز غیر ضروری علمی و قانونی موشگافیاں (hairsplitting) ہیں۔ آپ تمام مکاتبِ فکر کے سو (100) علما کی ایک سو گھنٹہ تقاریر یا مجالس سنیں۔ ان میں آپ کو یہ موضوعات ملیں گے کہ حضور نبی کریم ﷺ کو علم غیب تھا کہ نہیں؟ کیا آپ ﷺ حاضر و ناضر ہیں؟ کیا مردے قبر میں سنتے ہیں؟ کیا اللہ والے مشکل کشائی کر سکتے ہیں؟ کیا گیارھویں شریف شرک ہے؟ کیا آمین بالجہر کہنا صحیح ہے؟ نماز میں ہاتھ کہاں باندھنے چاہیں؟ نماز میں سر ڈھانپنا چاہیے کہ نہیں؟ نماز میں ٹخنے ننگے ہونے چاہیں کہ نہیں؟ کون سی شخصیت افضل ہے؟ کون سا فقہ افضل ہے؟ کیا وہ فرقہ کافر ہے؟ کیا وہ مشرک ہے؟ ان سو (100) گھنٹوں میں نوے (90) گھنٹے آپ کو یہ مضمون ملیں گے۔ باقی دس (10) گھنٹے شاید آپ کو اسلام کی حقیقی اور بنیادی تعلیمات پر گفتگو سننے کو مل سکے۔

اس تجزیے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم اصل محور سے ہٹ گئے ہیں۔ اصل موضوع سے دور ہیں۔ ہماری تمام کی تمام توانائیاں غیر ضروری کلامی (scholastic) و فقیہانہ (juristic) بحثوں میں

ضائع ہو رہی ہیں۔ ہماری تمام گفتگو ایک دوسرے کے خلاف ہے۔ اصلاح کی بجائے فساد پھیلا رہی ہے۔ ہم اپنے عوام کو توحید کی اصل روح نہیں سمجھا رہے۔ سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی سے منور نہیں کر رہے۔ عبادات کی اصل روح سے روشناس نہیں کرا رہے۔ اخلاق کے حسین زیور عطا نہیں کر رہے۔ خلوص اور سخاوت نہیں بتا رہے۔ پھر بھی سمجھ رہے ہیں کہ ہم دین کی خدمت کر رہے ہیں۔ دین کے علمبردار ہیں اور دین دنیا میں غالب آنے والا ہے۔ ایسی ہی صورت حال کے بارے میں قرآن مجید نے کہا ہے کہ

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا[1]

(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہہ دو کیا میں تمہیں بتاؤں جو اعمال کے لحاظ سے بالکل خسارے میں ہیں؟ وہ جن کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھو گئیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ بیشک وہ اچھے کام کر رہے ہیں)

قرآن کریم نے اس آیت میں ایک نفسیاتی بیماری کا ذکر کیا ہے۔ جس کو جدید علم نفسیات میں واہمہ (delusion) کہتے ہیں۔ ہم سب انفرادی اور اجتماعی طور پر اس واہمہ کا شکار ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی دینی گفتگو میں دین کی مبادیات (fundamentals) کی بات کریں۔ فرقہ واریت، مردم بیزاری اور انسان دشمنی ترک کر دیں۔ اپنی گفتگو میں نرمی و محبت پیدا کریں۔

فقیہِ شہر کی باتوں سے نالاں
خدا و احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و محراب و منبر

۱۔ سورۃ الکہف: آیت: 103-104

جوایک دفعہ آپ کے پاس آجائے اپنا دل ہار بیٹھے۔ آپ کی محبت اس کے دکھ درد کا مداوا (cure) بن جائے۔ اس کی زندگی میں ایمان کی بہار آجائے۔ جو آپ تک نہیں پہنچا، یا جس تک آپ نہیں پہنچے اس کی فکر میں آپ کی نیند بے مزہ رہنی چاہیے۔ آپ اپنے آپ کو لوگوں کے ایمان و اخلاق کے لیے گھولتے رہیں۔ کوئی سنے یا نہ سنے صدا دیتے رہیں۔ نالے بلند کرتے رہیں۔ پھر جلد افلاک سے نالوں کا جواب آئے گا۔ حجاب اٹھیں گے اور خطاب ہوگا۔ تب اللہ عزوجل کی زمین پر جنت بنے گی۔

(iii) عقلی رویے

ہمارا رویہ غیر عقلی (irrational) اور غیر متناسب (disproportionate) ہے۔ قرآن کریم تو ہر لمحے تفکر کی دعوت دیتا ہے مگر ہم خالص جذباتی انداز میں سوچتے ہیں۔ پہلے زمانے کے علما کرامؒ نے بہت محنت سے دین کے احکامات و اعمال کی درجہ بندی (categories) کی۔ اگرچہ اس سے معاملات وعبادات میں سختی پیدا ہوئی لیکن یہ بھی طے کرنا آسان ہوگیا کہ کسی چیز کی کتنی اہمیت ہے؟ مثال کے طور پر عبادات کو دیکھیں۔ یہ طے کر دیا گیا کہ کیا فرض ہے؟ کیا واجب ہے؟ کیا سنت ہے؟ کیا مستحب ہے؟ کیا فرض کفایہ ہے؟ اس درجہ بندی کا فطری اور لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو چیز فرض ہے وہ واجب سے زیادہ اہم ہے۔ جو واجب ہے وہ سنت سے زیادہ اہم ہے۔ جو سنت ہے وہ نفل سے زیادہ اہم ہے لیکن ہم اس مقصد کو بھول گئے اور پورا زور درجہ بندی کی بحث میں لگا دیا۔ اس درجہ بندی کا فرق بھول گئے۔

نماز کی مثال لے لیں۔ نماز میں کیا اصل ہے؟ خاص طرح کا انداز یا اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان؟ نماز کے لیے ٹوپی، ٹخنوں کا ننگا ہونا اور آمین کا آہستہ یا اونچا کہنا زیادہ سے زیادہ سنت سے متعلق

مسائل تھے۔ اصل بات تو یہ تھی کہ کیا نماز میں احسان[1] حاصل ہے کہ نہیں؟ کیا نماز میں دکان یاد

[1]۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس مبارک میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک آدمی آیا، جس کا لباس نہایت صاف ستھرے اور سفید کپڑوں پر مشتمل تھا اور جس کے بال نہایت سیاہ تھے۔ اس آدمی پر نہ تو سفر کی کوئی علامت تھی اور نہ ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا تھا۔ وہ آدمی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتنے قریب آ کر بیٹھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھٹنوں سے اپنے گھٹنے ملا لئے اور پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی دونوں رانوں پر رکھ لئے۔

اس کے بعد اس نے عرض کیا، اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھ کو اسلام کی حقیقت سے آگاہ فرمایئے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ تم اس حقیقت کا اعتراف کرو اور گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور پھر تم پابندی سے نماز پڑھو زکوۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور زادِ راہ میسر ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔

اس آدمی نے یہ سن کر کہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سچ فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس پر ہمیں تعجب ہوا کہ یہ آدمی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کرتا ہے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جواب کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ پھر وہ آدمی بولا، اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اب ایمان کی حقیقت بیان فرمایئے؟ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو، اس کے رسولوں کو اور قیامت کے دن کو دل سے مانو اور اس بات پر یقین رکھو کہ برا بھلا جو کچھ پیش آتا ہے وہ تقدیر کے مطابق ہے۔

اس آدمی نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سچ فرمایا۔ پھر بولا اچھا اب مجھے یہ بتایئے کہ احسان کیا ہے؟ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر (یہ دھیان میں رکھو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

پھر اس آدمی نے عرض کیا قیامت کے بارے میں مجھے بتایئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس بارے میں جواب دینے والا، سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔ اس کے بعد اس آدمی نے کہا اچھا اس کی کچھ نشانیاں ہی مجھے بتا دیجئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لونڈی اپنے آقا کو جنے گی اور برہنہ پا، برہنہ جسم مفلس وفقیر اور بکریاں چرانے والوں کو تم عالی شان مکانات میں فخر وغرور کی زندگی بسر کرتے دیکھو گے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد وہ آدمی چلا گیا اور میں نے کچھ دیر توقف کیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی مجھ سے پوچھا، اے عمر (رضی اللہ عنہ)! جانتے ہو سوالات کرنے والا آدمی کون تھا؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ جبرائیل علیہ السلام تھے جو تم لوگوں کو تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔ (صحیح بخاری۔ جلد اول: رقم: ۴۹ بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ؛ صحیح بخاری۔ جلد دوم: رقم: ۱۹۸۲ بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ؛ صحیح مسلم۔ جلد اول: رقم: ۹۶ بروایت حضرت یحیی بن یعمر رضی اللہ عنہ؛ صحیح مسلم۔ جلد اول: رقم: ۱۰۰ بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ؛ صحیح مسلم۔ جلد اول: رقم: ۱۰۲ بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ؛ سنن ابوداؤد۔ جلد سوم: رقم: ۱۲۹۱ بروایت حضرت یحیی بن یعمر رضی اللہ عنہ؛ سنن نسائی۔ جلد سوم: رقم: ۱۲۹۹ بروایت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ؛ سنن نسائی۔ جلد سوم: رقم: ۱۳۰۰ بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ)

آتی ہے یا کبھی کبھار خدا بھی یاد آ جاتا ہے۔ نماز میں کیا اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھتے ہیں یا ہم انہیں دیکھتے ہیں؟ ہماری صورت حال یہ ہے کہ ایک دوست نے کہا کہ بہت سی بھولی بسری چیزیں مجھے نماز کی نیت باندھتے ہی یاد آنے لگتی ہیں۔ حضرت اقبالؒ نے کیا خوبصورت ارشاد فرمایا ہے:

جو میں سر بسجدہ ہُوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں[1]

میں نے نماز پر سینکڑوں تقاریر سنی ہیں۔ موضوع عام طور پر نماز کے فقیہانہ مسائل ہوتا ہے۔ شاذونادر (rare) یہ موضوع سننے کو ملتا ہے کہ نماز اصل میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا بہانہ ہے۔ یہ معراج ہے۔ یہ تہذیبی عمل ہے۔ انصاف، برابری اور اخوت سکھاتی ہے۔

آپ خود مطالعہ کر لیں۔ ایک سو (100) مساجد میں لٹکے ہوئے نماز سے متعلق اشتہارات اور پوسٹروں کا تجزیہ کریں۔ آپ کو 99 فیصد قانونی پہلوؤں پر بحث ملے گی۔ کیا چھوٹی داڑھی والا امام ہوسکتا ہے؟ کیا پتلون میں نماز جائز ہے؟ کیا ٹی وی دیکھنے والا امام بن سکتا ہے؟ یہ معاملات نظر نہیں آئیں گے کہ نماز میں دھیان کیسے پیدا ہو؟ اپنے رحیم مالک کے جناب میں حضوری کیسے ہو؟

میں ایک اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتا ہوں۔ میں ولایت (England) میں زیر تعلیم (1997ء) تھا۔ لندن کے جنوب مشرقی علاقے کینٹ (Kent) میں رہنے والے میرے ایک دوست نے ہماری دعوت کی۔ جس میں اندازاً بیس (20) کے قریب مسلمان طالب علم اور ایک ہندو رات کے کھانے پر مدعو تھے۔ میزبان اور اس کے اہل خانہ کھانا پکا رہے تھے۔ ولایت کی روایت کے مطابق ہم

۱۔ غزل؛ بانگ درا از محمد اقبالؒ

سب ان کی مدد میں لگ گئے۔تھوڑی دیر بعد نماز مغرب کا وقت ہو گیا۔ ولایت کے رہنے والے تقریباً اٹھارہ (18) نوجوان (جنہوں نے جینز کی پتلونیں پہنیں تھی۔ ایک کے علاوہ جن کی داڑھیاں بھی نہ تھیں) وضو میں تھے۔اصرار کرنے لگے میں نماز پڑھاؤں۔ میں نے ولایت میں رہنے والے ایک بائیس (22) سالہ نوجوان کو زبردستی آگے کر دیا۔جس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تو تھی مگر جینز کی پتلون تھی۔ بڑے بڑے فوجی بوٹ پہن رکھے تھے۔ اس نے بوٹوں سمیت نماز پڑھائی۔ میں نے اتنی پر اثر نماز کبھی نہیں دیکھی۔ میں نے بہت سے غزالی زمان اور رازی دوران دیکھے ہیں۔ پیر طریقت دیکھے ہیں مگر ولایت میں رہنے والے اس چھوٹی داڑھی والے بوٹوں سمیت نماز پڑھانے والے کی شان ہی کچھ اور تھی۔حرمین[1] کے علاوہ میں نے نماز میں اور امامت میں اتنی حلاوت کبھی نہیں دیکھی۔

میری منشاء کسی پر تنقید نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اصل شے روحِ بلالی ہے۔جس کی طرف ہماری توجہ ہی نہیں جاتی۔ ظاہر و باطن کا تناسب ہم نے کھو دیا ہے۔میرا عقیدہ ہے کہ ظاہر بھی لازم ہے۔اس لیے ظاہر کے بغیر باطن بے کار ہے مگر ظاہر کا مقابلہ روح سے ہوگا تو روح کو ترجیح دینا ہوگی۔

ایک اور مثال لیں، غیبت اسلام میں سخت ناپسندیدہ ہے۔اپنے بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے۔سگریٹ پینا اکثر علما کے نزدیک صرف مکروہ ہے لیکن ہماری دینی سوچ عجیب ہے۔غیبت کرنے والے کو کچھ نہیں کہتے مگر سگریٹ پینے والا بہت برا سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس میں کوئی دوسری

---

[1]۔ مسجد الحرام اور مسجد نبوی کو مجموعی طور پر حرمین الشریفین کہا جاتا ہے۔

رائے نہیں ہوسکتی کہ غیبت بدتر شے ہے۔

میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم نے اسلامی فکر کا توازن کھو دیا ہے۔ مختلف اشیا کے درمیان توازن کھودیا ہے۔ اہم کو غیر اہم اور غیر اہم کو اہم سمجھنے لگے ہیں۔ نفل کو فرض سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ مکروہ کو حرام سے زیادہ برا سمجھتے ہیں۔ چالیسواں، جمعہ کی نماز سے زیادہ اہم ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس غیر متوازن فکر نے ہماری پوری زندگی کو ٹیڑھا کر دیا ہے۔ سماجی ومعاشی زندگی بے ہنگم ہوگئی ہے۔ ہستی کیا ہے؟ ترتیب کا نام ہے۔ توازن کا نام ہے۔ برج نرائن چکبست نے کیا خوب کہا ہے:

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے، انہی اجزا کا پریشاں ہونا

ان حالات میں ہمارے لیے لازم ہے کہ ٹھنڈے دل سے سوچیں اور اضطرابی طرزِ فکر چھوڑ دیں۔ اضطراب میں چھوٹی شے بڑی نظر آتی ہے اور بڑی شے چھوٹی نظر آتی ہے۔ ہم بھی فکری اضطراب کا شکار ہیں۔ جس کے سبب فکری توازن سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اس کو بدلنا ہوگا وگرنہ تہذیبی کجی (distortion) برقرار رہے گی۔

2۔ دین ودنیا کی تفریق کا خاتمہ

ہمیں دین ودنیا کی تفریق کو مٹانا پڑے گا۔ بچپن میں جب میں کبھی اعلیٰ تعلیم، اچھی ملازمت، اچھے گھر کی بات کرتا تھا تو میرے ایک انتہائی قریبی اور مذہبی دوست مجھے دنیا کا کتا کہتے تھے۔ پہلے تو میں اسے محبت کی ایک رسم سمجھتا رہا بعد میں، میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے مجھے ایک حدیث

سنائی کہ دنیا مردار ہے اوراس کے چاہنے والے کتے ہیں۔ میں نے انہیں عرض کیا کہ اس حدیث کا یہ مفہوم نہیں جو آپ بیان کررہے ہیں۔ آپ سوچیں کہ ایک دنیاوی ترقی کے خواہش مند طالب علم کو جب آپ اس طرح برا بھلا کہیں گے تو کیا وہ اعلیٰ سائنسدان بننے کی خواہش کرے گا۔ اعلیٰ تعلیم، اعلیٰ کاروبار، اعلیٰ سواری اسے مردار لگیں گی اور وہ دنیا کا کتا نہیں بننا چاہے گا۔ اس کا رویہ دنیا کے خلاف ہوجائے گا۔

دین و دنیا کی تفریق کا تصور مطلقاً غیر اسلامی ہے۔ یورپی نومسلم عالم دین جناب محمد اسد[1] (Leopold Weis, d. 1992) نے دنیا کے بارے میں مسلمانوں کے معتدل نقطہ نظر کو یوں بیان کیا ہے:

اسلام عیسائیت کی طرح دنیا کے متعلق بری رائے نہیں رکھتا۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہم دنیاوی زندگی کی قدروقیمت میں موجودہ مغربی تہذیب کی طرح مبالغہ نہ کریں۔ عیسائیت دنیاوی زندگی کی مذمت کرتی ہے اور اس سے نفرت رکھتی ہے۔ موجودہ یورپ عیسائیت کی اصل روح کے خلاف ابوالہوس کی طرح زندگی پر گرتا ہے۔ زندگی کو نگلتا ہے مگر اس کی عزت نہیں کرتا۔ اسلام عیسائیت اور مغرب کے برعکس اس کو سکون اور احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اسلام زندگی کی پرستش نہیں کرتا لیکن اسے بلندتر زندگی کے سفر کے لیے لازم تصور کرتا ہے مگر اس سے گزر جاتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ

---

[1]۔ Leopold Weis؛ محمد اسدؒ (1900ء-1992ء) ایک جرمن مسلم سکالر تھے جنہوں نے یہودی مذہب کو خیر باد کہہ کر اسلام قبول کرلیا تھا اور اسلامی دنیا کو ہی اپنا مسکن بنالیا۔ محمد اسدؒ اسلامی موضوعات پر کئی تحقیقی کتب کے مصنف بھی ہیں۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً [1]

(اے اللہ! ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی)

یہ اس دنیا کی نعمتیں ہماری روحانی جدوجہد کے راستہ میں رکاوٹ نہیں۔ مادی ترقی نہ تو ہمارا مقصد ہے اور نہ ہی قابل نفرت [2]۔

اسلام دین وحدت ہے۔ توحید ایک مجرد (abstract) تصور نہیں ہے بلکہ عملی نظریہ ہے۔ توحید ایک نظریہ حیات ہے۔ یہ ہر چیز میں وحدت کا (oneness) قائل ہے۔ دنیا و دین کی وحدت، دنیا و آخرت کی وحدت، علم و عمل کی وحدت، روح و جسم کی وحدت، قبائل اور علاقوں میں وحدت، مذہب و علم میں وحدت، امارت و غربت میں وحدت۔ اسلام کے نزدیک خدا ایک ہے۔ علم ایک ہے۔ دنیا ایک ہے۔ انسان ایک ہے۔ انسانی عمل ایک ہے۔ دنیا اور دین ایک ہیں (اچھی طرح سے دنیا میں رہنے کا نام دین ہے اور دین پر عمل کرنے سے دنیا اچھی ہوگی)۔ جدید و قدیم علم کی بحث کم نظری ہے۔ موت و حیات ایک ہے۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام صرف ہمارے جسم کو چھوتا ہے۔ موت سے فنا نہیں آتی بلکہ زندگی شکل بدل لیتی ہے۔ حضرت اقبالؒ فرماتے ہیں:

فرشتہ موت کا چھُوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دُور رہتا ہے [3]

قرآن کریم نے حکم دیا ہے کہ

---

[1]۔ سورۃ البقرہ: آیت: 201

[2]۔ Islam at the Crossroad by Muhammad Asad, p. 26

[3]۔ موت؛ ضرب کلیم از محمد اقبالؒ

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ[1]

(جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو، شاید تم کامیاب ہو جاؤ)

قرآن پاک نے رزق کی تلاش کو اللہ تعالیٰ کا فضل کہا ہے۔ یہ یہود کا عمل تھا کہ یوم سبت (ہفتہ کے دن) صرف عبادت کرنا ہے۔ دنیا کے دھندے میں نہیں پڑنا۔ اسلام میں جمعہ کی نماز کی عبادت سے فارغ ہو کر رزق کی تلاش کی عبادت میں شامل ہونے کا حکم ہے۔ مسجد میں بیٹھ کر خاموشی سے ذکر کرنے کا حکم نہیں ہے۔ ہم نے دین کا تصور دنیا چھوڑ کر خالص رہبانی (monastic) تصور دین اختیار کر لیا ہے کہ دین الگ ہے اور دنیا الگ ہے۔ ہم نے دنیا میں رہنا ہے۔ اس کو مسخر کرنا ہے۔

آیئے میں آپ کو چند مثالیں دوں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ[2] میں شامل تھے۔ ان کی وفات پر بے پناہ سونا ان کے ترکہ میں شامل تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی دنیاوی دولت ان کی مذہبیت کو جلا بخشتی رہی۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے بلکہ دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ہمارے تاریخ کا کوئی بھی عالم اور سائنسدان ایسا نہیں تھا جو دنیاوی کاروبار میں مشغول نہ تھا۔

دین و دنیا کی تفریق تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت مٹا دی تھی جب اللہ پاک کی طرف سے

---

[1]۔ سورۃ الجمعہ: آیت: 10

[2]۔ وہ دس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جنہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا میں ہی بار بار جنت کی بشارت دی۔

سکھائی جانے والی یہ دعا ہمیں ارشاد فرمائی:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّفِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً[1]

(اے ہمارے رب ہمیں دنیا کی بھلائیاں عطا فرما اور ہمیں آخرت کی بھلائیاں عطا فرما)

دین و دنیا کے باہمی رشتہ کے متعلق دو مثالیں دینا چاہتا ہوں۔ اعلیٰ گھر، اعلیٰ سواری، اعلیٰ کاروبار، سونا اور چاندی دنیا داری نہیں بلکہ دنیاداری اللہ تعالیٰ سے غافل ہونے کا نام ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

چیست دنیا از خدا غافل بدن

نی قماش و نقرہ و میزان و زن[2]

(دنیا کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے غافل ہونا دنیا ہے۔ اچھا لباس، چاندی، اولاد اور خاندان دنیا نہیں ہے)

اس کا سادہ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک آدمی رات کو تہجد پڑھ رہا ہے اور اس کے دل میں دنیا کی اشیا کی ہوس ہے تو وہ خدا سے غافل ہے لیکن اگر کوئی آدمی ایک ارب روپے کے گھر میں ہے۔ ایک کروڑ روپے کی گاڑی میں ہے اور اس کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہے تو وہ دین دار ہے۔ میں نے ایسے دنیادار دیکھے ہیں جو مکمل طور پر خدامست تھے۔ ایسے دین دار بھی دیکھے ہیں جو مکمل طور

---

[1]۔سورۃ البقرہ: آیت:201

[2]۔بیان ترجیح دادن شیر جهد را بر توکل و فوائد جهد را بیان کردن؛ مثنوی رومی از مولانا جلال الدین رومیؒ: جلد اول

دنیا کے طالب ہیں اور دعویٰ کے باوجود خدا سے مکمل غافل ہیں اور ان کے ساتھ بیٹھا نہیں جا سکتا۔

دوسری مثال یہ ہے کہ اگر کشتی پانی میں رہے تو ٹھیک ہے بلکہ کشتی کے وجود کے لیے پانی لازم ہے۔ لیکن اگر کشتی کے اندر پانی چلا جائے تو کشتی ڈوب جاتی ہے۔ اگر ہم کشتی کی طرح دنیا پر تیرتے رہیں تو بہت اچھا ہے لیکن اگر دنیا ہمارے دین کی کشتی میں داخل ہو جائے تو پھر تباہی ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

آب در کشتی ہلاکِ کشتی است
آب اندر زیر کشتی پشتی است[1]

ہمیں دین و دنیا کی دوئی (duality) کی تعلیم نہیں دینا چاہیے۔ اس تعلیم سے اچھی سوچ والا طبقہ اپنا ایمان بچانے کے لیے دنیا کے کاروبار سے الگ ہو جاتا ہے یا بددلی سے کام کرتا ہے۔ دنیا صحیح معنوں میں دنیا کے کتوں کے حوالے ہو جاتی ہے۔ جس سے دین داروں کو اور زیادہ نقصان ہوتا ہے بلکہ بعض حالات میں مذہبی طبقہ اپنی مذہبی رسومات تک کے لیے اہل دنیا کا محتاج ہو جاتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی فکر صحیح کریں۔ جب تک یہ فکر صحیح نہیں ہوگی ہم ترقی نہیں کر سکتے۔

کبھی کبھی مجھے ہنسی آتی ہے کہ ایک طرف ہم اپنے ماضی میں اپنی دنیاوی شان وشوکت کا بہت فخر سے اعلان کرتے ہیں اور دوسری طرف دنیا چھوڑنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ دنیا چھوڑنا خالصتاً رہبانی فعل ہے۔ جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

---

[1]- بیان ترجیح دادن شیر جهد را بر توکل و فوائد جهد را بیان کردن؛ مثنوی رومی از مولانا جلال الدین رومیؒ: جلد اول

اگر ہم دنیا کو فتح نہیں کریں گے اور اسے حاصل نہیں کریں گے تو دنیا کا رعب ہمارے دلوں کی پہنائیوں (recesses) میں سما جائے گا۔ ہم مانیں یا نہ مانیں ہمارا عمل اس کا شاہد ہوگا کہ ہم دنیا کے بندے ہیں اور دین کا صرف دکھاوا ہے۔ یہ بہت بنیادی بات ہے۔ اس پر توجہ نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر ہم عہد حاضر کی دوڑ سے خارج ہو چکے ہیں۔ اگر اپنی اصلاح نہ کی تو تاریخ کا قصہ پارینہ بن جائیں گے اور ہمارا ذکر صرف کہانیوں میں رہ جائے گا۔

3۔ شورائی نظام حکومت

سیاسی نظام کی اصلاح بہت اہم ہے۔ نظام کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک ہم اپنی سیاسی فکر نہیں بدلیں گے۔ اموی دور کے علما سے لے کر عہد حاضر تک ہماری کتابوں میں یہ بحث ملتی ہے کہ امیر (head of government) اہم ہے یا شوریٰ (Parliament)؟ شوریٰ عوام کی نمائندہ ہوگی یا بادشاہ سلامت کی منتخب کردہ (nominated)؟

ہماری عمومی سیاسی فکر یہ سمجھتی ہے کہ شوریٰ کے مقابلے میں امیر زیادہ اہم ہے۔ بادشاہ کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی شوریٰ بنائے۔ شوریٰ صرف مشورہ دے سکتی ہے۔ امیر پر اس مشورہ کا ماننا لازم نہیں ہے۔

آپ ذرا ایک لحظہ کے غور کریں کہ یہ خالص ملوکیت و آمریت نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ ایک بار کوئی مہم جو (adventurer) امیر بن جائے تو پھر اپنی مرضی سے اپنی شوریٰ بنالے اور کبھی کبھار شوریٰ سے مشورہ کر لے لیکن فیصلہ اپنی صوابدید (discretion) پر کرے اور پھر یہ کہے کہ اسے اللہ عزوجل نے حاکم بنایا ہے۔ اس وقت تک حاکم ہے جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ اس لیے

اللہ پاک جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے۔اللہ جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے اور امیر پر اللہ پاک کی رحمت ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ امیر کی راہنمائی کرتا ہے۔امیر زمین میں اللہ عزوجل کا سایہ ہے۔جو اس کی اطاعت کرے گا وہ اللہ پاک کی اطاعت کرے گا۔جو بادشاہ کی توہین کرے گا وہ اللہ پاک کی توہین کرے گا۔یہ وہ مسخ شدہ (distorted) تعبیر ہے جو ہمارے بادشاہوں نے اپنے اقتدار کے حصول اور دائمی (perpetual) رکھنے کے لیے پیش کی ہے۔میری دیانتدارانہ رائے میں اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

عہد حاضر میں اگرچہ عمومی فکر تو یہی ہے لیکن کچھ علما اور دینی جماعتوں نے اس فکر کو چیلنج کرنا شروع کر دیا ہے۔میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کروں گا۔1947ء میں جب اسلام کے نام پر پاکستان وجود میں آیا تو یہ بحث شروع ہوگئی کہ سیاسی نظام کیا ہوگا۔اس پس منظر کے ساتھ 1949ء میں دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد (Objectives Resolution) منظور کی گئی۔اس قرارداد کو پاکستان کے تقریباً تمام علماء کی حمایت حاصل تھی اور آج تک تمام مذہبی طبقہ اس کو قبول کرتا ہے۔اس قرارداد نے اقتدار کا صحیح اسلامی تصور پیش کیا۔جس کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات پر اصل حاکمیت (soveriengty) اللہ تعالیٰ کی ہے۔اس نے اپنا اختیار پاکستان کی ریاست کو تفویض (delegate) کیا ہے۔جسے پاکستان کے عوام استعمال کریں گے۔یہ اقتدار ایک مقدس امانت (secred trust) ہے۔ ریاست یہ اختیار عوام کے منتخب نمائندوں (chosen representatives) کے ذریعے استعمال کرے گی۔اس نظام میں جمہوریت، آزادی، برابری، رواداری اور سماجی انصاف ہوگا۔جہاں اقلیتوں کے حقوق کا مکمل تحفظ ہوگا۔بنیادی انسانی حقوق کو یقینی بنایا جائیگا۔

آپ ذرا اس قرارداد پر غور کریں۔ اقتدار کسی بادشاہ کے لیے نہیں ہے۔ کسی صدر اور وزیراعظم یا امیرالمومنین کے لیے نہیں ہے بلکہ پاکستان کے عوام کے لیے ہے۔ جسے عوام اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کریں گے۔ علما اور سیاسی لیڈروں کا یہ متفقہ اعلان تھا کہ اصل حکمران عوام ہیں اور وہ حکمرانی انتخاب کے ذریعے حاصل کریں گے۔ کوئی الوہی حقوق (divine rights) نہیں ہوں گے۔ کوئی امیرالمومنین عوام کی مرضی کے خلاف نہیں ہوگا۔ کوئی حاکم اپنی مرضی سے اپنی شوریٰ نہیں بنائے گا بلکہ عوام کے منتخب نمائندوں کا پابند ہوگا۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ دولت، خاندان یا بندوق کی طاقت سے عوام کی گردن پر سوار ہوجائے۔

اچھی بات یہ ہے کہ پاکستان کی آج کل کی مذہبی سیاسی جماعتیں بھی اس فکر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ عوام کے ووٹ کے ذریعے منتخب ہوکر آنے کے بعد پارلیمنٹ کی بالادستی کا دعویٰ کرتی ہیں۔ میں مذہبی سیاسی جماعتوں کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ سیاسی جماعتوں کی یہ سوچ اسلامی سوچ ہے۔ اس لیے کہ اسلامی سیاسی فلسفہ حاکم کی بجائے عوام کو اصل مانتا ہے۔ مسلمانوں کے پہلے خلفاء ہر لمحے عوام کے سامنے جوابدہ تھے۔ پارلیمنٹ کی جو بھی ابتدائی شکل تھی۔ وہ اس کے سامنے مکمل طور پر جوابدہ تھے۔

قراردادِ مقاصد کے بعد، میں ملائشیا، ترکی اور ایران کی مثال دوں گا۔ ان برادر اسلامی ممالک میں کسی نہ کسی درجے میں عوامی طاقت سے ہی مسلمان حکومتیں بنی ہیں۔

عوام کی حاکمیت کا تصور جو اسلام میں چودہ سو سال سے ہے اور اہلِ مغرب نے سولہویں صدی میں اختیار کیا ہے۔ ہمارے سیاسی عمل میں آجکل بھی مکمل طور پر عمل پذیر نہیں ہوسکا۔ اکثر اسلامی

ممالک میں حکمران عوام کی مرضی کے خلاف عوام کی گردنوں پر سوار ہیں۔کبھی کہتے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اقتدار دیا ہے اور کبھی ہماری تہذیبی سیاسی طاقتیں کسی نہ کسی شکل میں ان کا ساتھ دیتی ہیں۔

اہل اسلام کو سوچ سمجھ کر یہ پختہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ انہیں عوامیت کا علمبردار بننا ہے اور یہ کہ اسٹیبلشمنٹ سے تعلق مناسب نہیں۔ اہل اسلام کو انقلابی طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔عوام کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔عوامی زبان بولنی چاہیے۔ ظالم حکمرانوں اور مصنوعی اقتدار سے دوری اختیار کرنی چاہیے۔حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا کردار ادا کرنا چاہیے۔

اہل اسلام کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اسلام کا نام لینے والا ہر طالع آزما (adventurer) اسلام کا نمائندہ نہیں ہے۔ پاکستان کا مرد آہن ضیاء الحق (Zia-ul-Haq, d. 1988) ہو یا سوڈان کا جنرل عمر حسن احمد البشیر اسلام کے نہیں بلکہ اسٹیبلشمنٹ کو لوگ تھے۔ جو عوام کی مرضی کے خلاف ان کی قسمتوں کے مالک بن گئے تھے۔ چونکہ ان کے پاس توپ تھی وہ اسلام کو اپنی حکومت کے استحکام کے لیے استعمال کرتے رہے۔ یہ اہل اسلام کی نفسیاتی بے بسی (helplessness) ہے کہ ہر مہم جو (adventurer) جب اسلام کا نام لیتا ہے وہ اس کی حمایت کرتے ہیں۔انہیں اپنی بے بسی برداشت کرنی چاہیے اور اس بے بسی کو عوام کی حمایت سے طاقت میں بدلنا چاہیے۔ اسٹیبلشمنٹ کی براہ راست (directly) یا بالواسطہ (indirectly) حمایت نہیں کرنی چاہیے۔ ان کی طاقت اور استحکام کا سبب نہیں بننا چاہیے۔اس کے برعکس ہر لمحے اور ہر فیصلے کے وقت عوام کو ترجیح دینی چاہیے۔ چاہے اس کا وقتی طور پر نقصان ہو۔اس سے عوام کی نگاہ میں اہل اسلام کا اعتماد بڑھے گا جو بالآخر فائدہ مند ہوگا۔ایران اور ترکی کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔ جہاں

اہل اسلام خالص عوام کے بل بوتے پر پوری دنیا کی مخالفت کے باوجود اقتدار میں آئے ہیں۔

اس بات کا بھی دھیان رکھنا چاہیے کہ اقتدار میں آنے کے بعد حکومت عوام کی ہونی چاہیے کسی خاص گروہ کی اجارہ داری (monopoly) نہیں ہونی چاہیے بلکہ عام مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیے۔ افغانستان اس ضمن میں مکمل طور پر ناکام ہوا ہے اور اسلام کی جگ ہنسائی کا سبب بنا ہے۔ اس لیے کہ وہاں سیاسی فکر خالصتاً ملوکیت والی تھی کہ ایک فرد یا ایک ٹولہ عوام کی قسمتوں کا مالک ہے۔ وہ فرد چاہے خلیفہ ہو یا امیر المومنین، مسٹر ہو یا مولوی۔ کچھ حد تک یہی صورت حال ایران میں ہے۔ اگر علماء نے ایران میں اقتدار عوام کے سپرد نہ کیا تو آپ چند سالوں میں ایک اور انقلاب دیکھیں گے جو ولایت فقیہہ کے تصور کے خلاف ہوگا۔ پھر شاید وہاں عوامی بادشاہت قائم ہو جائے اور اچھا ہے کہ ایران اصلاح کی طرف بڑھ رہا ہے۔ عرب ممالک کو دیکھیں وہاں اسلام کی ابتدا ہوئی۔ ہمارے مقدس ترین مقامات وہاں ہیں۔ وہاں خالص خاندانی ملوکیت ہے۔ عوام کی حاکمیت سے کوئی تعلق نہیں۔ وہاں کے اکثر علماء اس ملوکیت کے محافظ ہیں۔ ملوکیت کے مخالفوں کے سر علماء کے فتوؤں کے بعد تن سے جدا کیے جاتے ہیں۔ اس ساری بحث کا ایک اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اگر ہم کسی مسلمان بادشاہ کی ملوکیت کے خلاف بات کریں تو ہمیں اسلام کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔

میں آپ کو قرآن مجید سے ایک واقع سنانا چاہتا ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کوئی ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ یمن میں قوم سبا کی حکومت تھی۔ اپنے زمانے کے یہ سب سے زیادہ تہذیب یافتہ اور امیر لوگ تھے۔ بارش کے پانی کو کنٹرول کرنے کے لیے ڈیم بنا رکھے تھے۔ اپنے خاص جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے مشرق وسطیٰ، افریقہ اور ایشیاء کے مابین تجارت کنٹرول کرتے تھے۔ ملکہ سبا

ان کی حکمران تھی۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی فوجوں نے اس کی سلطنت کا محاصرہ کیا تو ملکہ سبا (Queen of Sheeba) نے اپنے عمائدین (dignitories) کی مجلس بلائی اور سب سے ایک سوال کیا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ لڑنا چاہیے یا کہ ہتھیار ڈال دینے چاہیں؟ قرآن پاک کی سورۃ نمل کی آیت نمبر 33 میں عمائدین کا جواب لکھا ہے:

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ [1]

(وہ بولے کہ ہم قوت والے لوگ ہیں اور سخت جنگجو ہیں۔ البتہ فیصلہ آپ نے کرنا ہے جو بھی آپ فیصلہ کریں گی ہمیں قبول ہوگا)

ملکہ سبا نے اپنی تقریر میں کہا:

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ [2]

(بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں فساد پھیلاتے ہیں۔ اس کے عزت والے لوگوں کو بے عزت کر دیتے ہیں اور یہ بھی ایسا ہی کریں گے)

میری رائے میں جدید سیاسی تاریخ میں بادشاہت اور فوجی حکومت کے کردار کے بارے میں یہ سب سے زیادہ واضح بیان ہے۔ علامہ محمد اسد (Leopold Weis, d. 1992) نے اس آیت کی تشریح میں لکھا ہے کہ داخل ہونے سے مراد قوت سے داخلہ ہے۔ چاہے بیرونی حملے کی شکل میں ہو

۱۔ سورۃ النمل: آیت: 33

۲۔ سورۃ النمل: آیت: 34

یا کہ داخلی طور پر طاقت کے بل بوتے پر اقتدار پر قبضہ ہو۔ بادشاہ سے وہ شخص بھی مراد ہے جس نے طاقت کے زور پر اقتدار حاصل کیا ہو اور اپنے لوگوں کو طاقت کے زور پر غلام بنا رکھا ہو[1]۔

سید مودودیؒ (d. 1979) کے خیال میں ناجائز قابض اس لیے یہ کام کرتے ہیں تا کہ قوم بے بس ہو جائے۔ کوئی ان کے خلاف کھڑا نہ ہو سکے۔ وہ عزت نفس ختم کرتے ہیں۔ غلامی، خوشامد، جاسوسی وغیرہ کے کلچر کو رواج دیتے ہیں۔

فساد اور بے عزتی بہت جامع اصطلاحات ہیں۔ قرآن نے یہ دو الفاظ استعمال کر کے غاصبوں (userpurse) کی ذہنیت اور ان کے ہتھکنڈوں (tactics) پر بہت جامع تبصرہ کیا ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کیا پچھلے چار سو سالوں میں آپ کے ساتھ یہی نہیں ہوا؟ ایسٹ انڈیا کمپنی، تاج برطانیہ ہو یا پاکستان کے غاصب حکمران، سب نے یہاں فساد پھیلایا ہے۔ سب نے یہاں بے عزتی کو رواج دیا ہے۔

4۔ نیا دینی نظام تعلیم

ہمارا دینی نصاب تعلیم غور طلب ہے۔ اس کی کتب، ان کا باہمی توازن اور طرز تدریس قابل اصلاح ہے۔ لیکن ہم اس مسئلہ پر بہت جذباتی ہیں۔ میں یہ بات ابتداء ہی سے واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں مدارس کا حامی ہوں۔ میں نے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ دینی علوم جو ہم تک منتقل ہوئے ہیں یہ انہیں مدارس کی وجہ سے ہیں۔ علماء نے بھوک و پیاس میں نہایت درخشاں روایات

---

[1]۔ The Message of The Quran by Muhammad Asad

قائم کی ہیں لیکن حالات تغیر پذیر ہیں۔ ہمیں بھی حرکت کرنا ہوگی۔ اس ضمن میں چند باتیں غور طلب ہیں۔

(i) قرآن پاک کی تعلیم

قرآن مجید کلام الٰہی ہے۔ حکمت کا سب سے بڑا خزانہ ہے لیکن اس کو مدارس میں نہیں پڑھاتے یا بہت کم پڑھاتے ہیں۔ کچھ ترجمہ پڑھاتے ہیں۔ ایک مختصر تفسیر (جلالین) پڑھاتے ہیں اور ایک پارہ بیضاوی (665ہجری) کی تفسیر سے پڑھاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا قرآن مجید اتنی ہی جگہ کا حق دار ہے؟ بالکل نہیں، بالکل نہیں۔ جلالین مختصر اور عمدہ تفسیر ہے۔ مگر کئی سو سال پہلے 911ہجری کی لکھی ہوئی ہے اور ہر کتاب اپنے عہد کے سیاسی و معاشی نظریات کے زیر اثر ہوتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ عہد حاضر کی کوئی تفسیر پڑھائیں۔

قرآن پاک سے زیادہ توجہ حدیث شریف اور فقہ پر دی جاتی ہے۔ حدیث پاک کی کم از کم سات کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ فقہ بھی چار سال پڑھائی جاتی ہے۔ ظلم یہ ہے کہ قرآن پاک و حدیث شریف پڑھاتے ہوئے تمام طاقت اپنا مسلک ثابت کرنے پر صرف ہوتی ہے۔ قرآن و حدیث کی ابدی تعلیمات کے حسن پر بالکل توجہ نہیں ہوئی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم پہلے قرآن مجید پڑھاتے، پھر حدیث پڑھاتے اور آخر میں فقہ پڑھاتے تا کہ قرآن کی روشنی میں ہم حدیث سمجھتے۔ حدیث کی روشنی میں ہم فقہ سمجھتے لیکن ہماری ترتیب الٹی ہے۔ ہم پہلے فقہ پڑھتے ہیں۔ گروہی و مسلکی نقطہ نظر پہلے قائم کرتے ہیں۔ اس مسلکی نقطہ نظر کی روشنی میں ہم احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جہاں ہمیں اپنے مسلک کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر احادیث کی روشنی میں قرآن پڑھتے ہیں۔

احادیث میں اعلیٰ ترین روایات سے لے کر موضوع روایت پڑھاتے ہیں۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ مسئلہ یہ بھی ہے کہ قرآن و حدیث کو بھی پرانی روایات کی روشنی میں پڑھتے ہیں۔ جنہیں اسرائیلیات[1] کہا جاتا ہے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا، لا الہ الا اللہ[2]

(ii) پرانا نصاب

مدارس میں ہم منطق (logic) پڑھاتے ہیں۔ جس کی بنیاد ارسطو (Aristotle, d. 322BC) کی منطق پر ہے جو اپنے زمانے کی بہترین تعلیم تھی مگر اب منطق وہ نہیں رہی۔ ڈھائی ہزار سال میں انسانی علم نے ترقی کر لی ہے مگر ہم وہیں کے وہیں ہیں۔ کم از کم آٹھ سو (800) سال پرانی کتب ہمارے نصاب میں شامل ہیں۔ جبکہ سولہویں صدی کے بعد جدید منطق علمی محاورے کا حصہ بن گئی ہے۔

ہم ریاضی بھی پڑھاتے ہیں۔ اقلیدس[3] (Euclid, d. n.d.) کو پڑھاتے ہیں جو چار سو قبل مسیح کا ریاضی دان تھا۔ اس کی جدید شکل ایف ایس سی (FSc) کی ریاضی ہے۔ چند سال پہلے

---

[1]۔ یہودی اور عیسائی مذہب کی کتابوں سے ملنے والی کہانیاں اسرائیلیات کہلاتی ہیں۔

[2]۔ غزلیں؛ یورپ میں لکھے گئے؛ بال جبریل از محمد اقبالؒ

[3]۔ Euclid؛ قلیدس ایک یونانی ریاضی دان تھا جو مصری شہر اسکندریہ میں تیسری صدی قبل مسیح میں رہا۔ اس کی کتاب ایلیمنٹس (elements) ریاضی کی تاریخ کی مشہور ترین اور سب سے زیادہ دیر تک پڑھائی جانے والی نصابی کتاب ہے جو انیسویں اور بیسویں صدی تک پڑھائی جاتی رہی ہے۔

ایف ایس سی (FSc) کی ریاضی کی کتاب کے دیباچے میں لکھا کہ یہ اقلیدس کے بنیادی اصولوں پر قائم ہے۔ ایف ایس سی کر کے بچے انجینئر بن جاتے ہیں لیکن مدارس کے طالب علم اقلیدس پڑھ کر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ ایف ایس سی (FSc) کی ریاضی کی کتاب نے اقلیدس کی ریاضی کو بنیاد بنا کر عہد حاضر تک کی فکر کو اپنے اندر سمویا ہے لیکن ہم اقلیدس (Euclid, d. n. d). کے احترام میں اس کی اصلی اور اڑھائی ہزار سال پرانی تعلیمات کے عشق میں گرفتار ہیں۔

یہ حال ادب کا ہے۔ ہمارا نصابی ادب جاہلیت (pre-islamic period) اور عباسی دور (750ء-1258ء) کا ہے۔ ہم زمانہ وسطیٰ اور عہد حاضر کے ادب سے ناواقف ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے امیر خسروؒ[1] (Amir Khusrow, d. 1325) اور ولی دکنیؒ[2] (Wali Deccani, d. 1707) کو تو پڑھا ہے مگر غالب (Ghalib, d. 1869) اقبالؒ (Iqbal, d. 1938) اور فیض (Faiz, d. 1984) سے واقف نہیں ہیں۔ ہم ابھی تک ارضیات (geology) اور علم الفلکیات (astronomy) کے وہ اصول پڑھاتے ہیں جو عہد یونان کے تھے۔ گیلیلیو (Galilio, d. 1642) اور نیوٹن (Newton, d. 1727) نے دنیا ہی الٹ دی ہے۔ پہلے زمین دنیا کا مرکز تھی اور اب سورج دنیا کا مرکز تصور کیا جاتا ہے۔ ہم ابھی دو ہزار سال پہلے کے زمانے میں رہتے ہیں۔ ہم چاند پر جانے کو ابھی بھی ناممکن سمجھتے ہیں۔

---

[1]- Amir Khusrow؛ امیر خسروؒ (1253ء-1325ء) فارسی اور اردو کے صوفی شاعر اور ماہر موسیقی تھے۔ انہیں طوطی ہند کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

[2]- Wali Mohammed Wali Deccani؛ ولی محمد ولی دکنی (1667ء-1707ء) برصغیر پاک و ہند کے کلاسیکل اردو کے شاعر تھے۔

دینی مدارس کا موجودہ نصاب اپنے مرتب کرنے والے کے نام کی نسبت سے درس نظامی کہلاتا ہے۔ یہ نصاب ملا نظام الدینؒ[1] (d. 1748) نے ترتیب دیا تھا۔ ملا صاحب لکھنو کے قریب واقع قصبہ سہالی کے رہنے والے تھے۔ آپ کا نسب مشہور صحابی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپؒ کا انتقال 1116 ہجری میں ہوا۔ آپ بحرالعلوم عبدالعلیؒ کے والد گرامی اور شاہ ولی اللہؒ[2] (d. 1762) کے ہم عصر تھے۔ آپؒ کا مدرسہ سہالی آگے جا کر مدرسہ فرنگی محل بنا۔ جس نے ہندوستان کی علمی وسیاسی تاریخ میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

ملا صاحبؒ نے نصاب کے لیے وہ کتب منتخب کیں جو اس زمانے میں مختلف علوم میں اعلیٰ درجہ (classic) رکھتی تھیں۔ یہاں ہم اختصار کے ساتھ مختلف مضامین کے لیے ان کی تجویز کردہ کتب، ان کے مصنفین کے نام اور مصنف کی تاریخ وفات لکھیں گے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ یہ کتب کتنی پرانی ہیں جو ہم مدارس میں پڑھا رہے ہیں۔

---

[1] ملا نظام الدینؒ (1677ء-1748ء) فاضلِ جید، عارف فنون رسمیہ، ماہر علوم نقلیہ وعقلیہ اور فقیہ اصولی تھے۔ آپؒ کو درس نظامی کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

[2] شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (1703ء-1762ء) برصغیر پاک وہند کے ایک مشہور مفکر، اسلامی سکالر، محدث فقہی اور صوفی بزرگ تھے۔ مجدد الف ثانیؒ اور ان کے ساتھیوں نے اصلاح کا جو کام شروع کیا تھا آپؒ نے اس کام کی رفتار اور تیز کردی۔ ان دونوں میں بس یہ فرق تھا کہ مجدد الف ثانیؒ چونکہ مسلمانوں کے عہد عروج میں ہوئے تھے اس لئے ان کی توجہ زیادہ تر ان خرابیوں کی طرف رہی جو مسلمانوں میں غیر مسلموں نے میل جول کی وجہ سے پھیل گئی تھیں لیکن شاہ ولی اللہؒ چونکہ ایک ایسے زمانے سے تعلق رکھتے تھے جب مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا تھا اس لئے انہوں نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر بھی غور کیا اور اس کے علاج کے بھی طریقے بتائے۔ آپؒ نے سب سے پہلے عجمی زبان فارسی میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ بخاری شریف کی شرح لکھی۔ دین اسلام کی عقلی توجیہات پیش کیں۔ حجۃ اللہ البالغہ آپؒ کی مشہور ترین تصانیف میں سے ایک ہے۔ جسے ہر دور میں پسند کیا گیا ہے۔

تفسیر قرآن (Exigesis of Quran)

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سنِ وفات
1	تفسیر جلالین	حضرت جلال الدین المحلیؒ	1459ء
		حضرت جلال الدین السیوطیؒ	1505ء
2	الفوز الکبیر	حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ	1762ء
3	مدارک التنزیل	حضرت عبداللہ بن حمد النسفیؒ	1310ء
4	انوار التنزیل	حضرت ناصر الدین البیضاویؒ	1266ء

ہر تفسیر اپنے زمانے کے حساب سے تعبیر ہوتی ہے۔ اب تفسیر جلالین کو چھ سو سال گزر گئے ہیں۔ ہمیں عہد حاضر کی کتب بھی پڑھانی چاہیں۔

حدیث شریف (Hadith)

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سنِ وفات
1	مشکوٰۃ المصابیح	حضرت امام ولی الدین محمد بن عبداللہؒ	1341ء
2	شرح نخبۃ الفکر	حضرت الحافظ ابن حجر عسقلانیؒ	1448ء
3	مقدمہ شیخ عبدالحق	حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ	1462ء
4	صحیح بخاری	حضرت امام اسماعیل بخاریؒ	869ء
5	صحیح مسلم	حضرت امام مسلم القشیریؒ	874ء
6	جامع ترمذی	حضرت امام محمد عیسیٰ ترمذیؒ	892ء
7	سنن ابی داؤد	حضرت امام سلیمان السجستانیؒ	886ء
8	سنن نسائی	حضرت امام احمد النسائیؒ	915ء

9	سنن ابن ماجہ	حضرت امام محمد القزوینیؒ	886ء
10	شرح معانی الآثار	حضرت امام ابوجعفر احمد بن محمد الطحاویؒ	933ء
11	شمائل ترمذی	حضرت مولانا محمد زکریاؒ	1981ء
12	موطا امام مالک	حضرت امام مالکؒ	795ء
13	موطا امام محمد	حضرت امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ	804ء
14	السنن الصغریٰ	حضرت امام شعیب السنائیؒ	915ء

عہد حاضر میں حدیث شریف پر بہت علمی کام ہوا ہے۔مغربی علما نے بہت علمی تنقید کی ہے۔ مسلمان علماء نے بھی کچھ تحقیق کی ہے۔ہمیں یہ سب کچھ بھی پڑھانا چاہیے۔

فقہ (Law)

نمبر شمار	کتاب	مصنف	سن وفات
1	مختصر القدوری	حضرت امام ابوالحسن احمد بن محمدؒ	907ء
2	شرح وقایہ	حضرت عبید اللہ ابن المسود المحبوبی الحنفیؒ	1346ء
3	اصول الشاشی	حضرت علامہ نظام الدین شاشیؒ	936ء
4	ہدایہ	حضرت برہان الدین مرغینانیؒ	1196ء
5	نورالانوار	حضرت شیخ احمد المعروف ملاجیونؒ	1718ء
6	نورالایضاح	حضرت شیخ حسن بن علیؒ	1688ء
7	شرح بر مسلم الثبوت	حضرت ملاحسن فرنگی محلیؒ	18ویں صدی
8	مسلم الثبوت	حضرت محب اللہ بہاریؒ	1707-8ء
9	البدایہ شرح الہدایہ	حضرت علی مرغینانیؒ	1196ء

10	کنز الدقائق	حضرت احمد نسفیؒ	710ء
11	سراجی	حضرت شیخ سراج الدین محمد بن عبدالرشیدؒ	1311ء

آخری کتاب بھی ساڑھے تین سو سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔اس طرح آپ عہد حاضر کے مسائل سے کیسے عہدہ برآء ہو سکتے ہیں؟ نہ صرف سماجی فکر میں تبدیلی آئی ہے بلکہ بالکل نئے علوم آ گئے ہیں۔مگر ہم وہیں کے وہیں ہیں۔ نئے عملی مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کے بارے میں ہم اپنے بچوں کو بالکل ہی نہیں پڑھا رہے۔

ادب (Literature)

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سن وفات
1	نفحۃ العرب	محمد اعزاز علی	1954ء
2	مقاماتِ حریری	ابو محمد القاسم حریری	1122ء
3	دیوان متنبی	ابو الطیب احمد ابن الحسین المتنبّی الکندی	965ء
4	دیوانِ حماسہ	حبیب بن اوس الطائی	845ء
5	مقامات البدیع	بدیع الزمان الحمدانی	1007ء
6	نفحۃ الیمان	احمد الشیر وانی	1320ء
7	المعلقات السبع	حماد الروایۃ	771ء
8	مختصر المعانی	مسعود بن عمر تفتازانی	1390ء

نثر و نظم ترقی کرتی رہتی ہے جبکہ ہم نو سو سال پہلے کا ادب پڑھا رہے ہیں۔ہمیں چاہیے کہ ان قدیم کتب کے کچھ حصے پڑھا لیں اور جدید عربی ادب لازمی طور پر نصاب میں شامل کریں۔ زبان زندہ ہوتی ہے۔ بدلتی رہتی ہے مگر ہم ماضی میں قید ہیں۔

بلاشبہ یہ کمال کا ادب ہے لیکن عہد حاضر کا ادب بالکل مختلف ہے۔ زبان بدل گئی ہے۔ موضوعات بدل گئے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ آپ ہومر [1] (Homer, d. 800BC) تو پڑھیں لیکن شیکسپیئر [2] (Shakespeare, d. 1616)، ورڈزورتھ [3] (Wordsworth, d. 1850)، شیلے (Shelley, d. 1822 [4]) نہ پڑھیں۔ حافظ شیرازیؒ [5] (d. 1390) اور امیر خسروؒ [6] (Amir Khusrow, d. 1325) پڑھیں مگر اقبالؒ (Iqbal, d. 1938) اور فیض [7] (Faiz, d. 1980) نہ پڑھیں۔

---

[1]۔ Homer؛ ہومر (800BC) ایک قدیم یونانی شاعر تھا۔

[2]۔ William Shakespeare؛ ولیم شیکسپیئر (1564ء-1616ء) ایک انگریز مصنف اور شاعر تھا جسے انگریزی زبان میں دنیا کے عظیم ترین مصنفین اور ڈرامہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شیکسپیئر کو انگلستان کا قومی شاعر مانا جاتا ہے۔ اس کی تصانیف میں تقریباً 38 ڈرامے، 154 گیت، دو لمبی نظمیں اور بہت سی چھوٹی نظمیں شامل ہیں۔ اس کے ڈرامے تقریباً دنیا کی سبھی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں اور کسی بھی دوسرے مصنف کے ڈراموں کی نسبت زیادہ پیش کیے جاتے ہیں۔

[3]۔ William Wordsworth؛ ولیم ورڈزورتھ (1770ء-1850ء) ایک مشہور برطانوی رومانوی شاعر تھا۔ اسے ملک الشعرا کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

[4]۔ Percy Bysshe Shelley؛ پیرسی بیش شیلے (1792ء-1822ء) انگریزی ادب کا معروف رومانوی شاعر تھا۔

[5]۔ حافظ محمد شیرازیؒ (1326ء-1390ء) فارسی کے مشہور شاعر تھے۔

[6]۔ Amir Khusrow؛ امیر خسروؒ (1253ء-1325ء) فارسی اور اردو کے صوفی شاعر اور ماہر موسیقی تھے۔ انہیں طوطی ہند کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

[7]۔ Faiz Ahmed Faiz؛ فیض احمد فیض (1911ء-1984ء) اردو ادب کے ترقی پسند شاعر تھے۔

منطق (Logic)

نمبرشمار	نام کتاب	مصنف	سن وفات
1	مِرقاۃ	حضرت مولانا فضل امام الخیرآبادیؒ	1829ء
2	شرح تہذیب	حضرت علامہ عبداللہ یزدیؒ	1606ء
3	قطبی	حضرت قطب الدین رازیؒ	1364-5ء
4	کبریٰ	حضرت میر سید شریف جرجانیؒ	1413ء
5	ھدایۃ الحکمت	حضرت اثیرالدینؒ	1261ء
6	ھدیۃ السیدیۃ	حضرت فضل حق خیرآبادیؒ	1861ء
7	حمداللہ (شرح سلام العلوم)	حضرت حمداللہ سندیلویؒ	19ویں صدی
8	الشماسیہ	حضرت نجم الدین القزوینیؒ	1099ء
9	القتبیہ	حضرت قطب الدین الرازیؒ	1364ء
10	التہذیب	حضرت التفتازانیؒ	1487ء
11	سلم العلوم لملاّ حسن	حضرت ملاحسن غلام مصطفیٰؒ	1794ء
12	شرح شمس البازعہ	حضرت محمد الفاروقیؒ	1409ء
13	تیسیرالمنطق	حضرت عبداللہ گنگوہیؒ	1921ء

یہ کتب بنیادی طور پر ارسطو[1] (Aristotle, d. 322BC) کی منطق کی شرح ہیں حالانکہ مغرب ارسطو سے بہت آگے جا چکا ہے۔نشاۃ ثانیہ (Renaissance) اور سائنسی انقلاب (Scientific Revolution) کے بعد منطق کی ہیئت (nature) اور موضوعات (subject) یکسر بدل گئے ہیں مگر ہم ابھی تک ارسطو کی محبت میں گرفتار ہیں جدید منطق و فلسفہ سے بے نیاز ہیں۔

---

[1]۔Aristotle؛ ارسطو (322BC-384BC) یونان کا ممتاز فلسفی، مفکر اور ماہر منطق تھا، جس نے سقراط جیسے استاد کی صحبت پائی اور سکندر اعظم جیسے شاگرد سے دنیا کو متعارف کروایا۔

علم الہیئت (Astronomy)

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سن وفات
1	الملخص فی الحیایہ	محمود الخوارزمی	13 ویں صدی
2	شرح قاضی	موسیٰ محمود الروحی	1436ء
3	تصریح الافلاک	بہاء الدین آمولی	1620ء
4	شرح التصریح	لطف اللہ المہندی	1732ء

گیلیلیو[1] (Galilio, d. 1645)، کیپلر[2] (Kepler, d. 1630) اور نیوٹن[3] (Newton, d.)

---

[1]۔ Galilio Galilei؛ گیلیلیو (1564ء-1642ء) ایک اطالوی ماہر فلکیات اور فلسفی تھا۔ گیلیلیو نے اشیا کی حرکات، دوربین، فلکیات کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کیں۔ اسے جدید طبیعیات کا باپ کہا جاتا ہے۔

[2]۔ Johannes Kepler؛ جان کیپلر (1571ء-1630ء) ایک جرمن ماہر فلکیات، ریاضی دان اور سترھویں صدی کے سائنسی انقلاب کی ایک بہت اہم شخصیت تھا۔ وہ سیاروں کی حرکت کے قوانین دریافت کرنے کے لیے مشہور تھا جس کی بعد میں آنے والے ماہر فلکیات نے تصدیق کی۔ اس کی تحقیق نیوٹن کی تحقیقات کی بنیاد بنی۔

[3]۔ Sir Isaac Newton؛ سر آئزک نیوٹن (1673ء-1727ء) ایک مشہور معروف طبیعیات دان، ریاضی دان، ماہر فلکیات، فلسفی اور کیمیا دان تھا۔ جس کا شمار تاریخ کی انتہائی اہم شخصیات میں ہوتا ہے۔ 1687ء میں چھپنے والی اس کی کتاب قدرتی فلسفہ کے حسابی اصول (Philosophiæ Naturalis Principia Mathematica) سائنس کی تاریخ کی اہم ترین کتاب مانی جاتی ہے۔ جس میں کلاسیکی میکینکس کے اصولوں کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی کتاب میں نیوٹن نے کشش ثقل کا قانون اور اپنے تین قوانین حرکت بتائے۔ یہ قوانین اگلے تین سو سال تک طبیعیات کی بنیاد بنے رہے۔ نیوٹن نے ثابت کیا کہ زمین پر موجود اجسام اور سیارے اور ستارے ایک ہی قوانین کے تحت حرکت کرتے ہیں۔ اس نے اپنے قوانین حرکت اور کیپلر کے قوانین کے درمیان مماثلت ثابت کر کے کائنات میں زمین کی مرکزیت کے اعتقاد کو مکمل طور پر ختم کر دیا اور سائنسی انقلاب کو آگے بڑھانے میں مدد دی۔

(1727 نے ہئیت کی شکل بدل دی ہے۔ ہماری یہ تمام کتب ان سے پہلے علماء خصوصاً بطلیموس[1] (Ptolemy, d. 170) کے نظریات پر لکھی گئی ہیں جو 170 عیسوی میں فوت ہو گیا تھا۔ اب تو رصدگاہوں (observators) کا زمانہ ہے۔ ہماری یہ تمام کتب بالکل بیکار اور غیر متعلق ہیں۔

ریاضی (Mathematics)

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سن وفات
1	خلاصہ فی الحساب	بہاءالدین آمولی	1620ء
2	تحریر اقلیدسی	نصیرالدین طوسی	1273ء

آپ خود اندازہ لگائیں کہ ہم چار سو سال پہلے والا علم حساب پڑھا رہے ہیں جو دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ اقلیدس دو سو قبل از مسیح کی ہے۔ اس کی طوسی کی شرح آج سے آٹھ سو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ ماضی سے محبت مناسب ہے مگر اتنی بھی نہیں کہ ہم غاروں میں رہتے رہیں۔ عہد حاضر کا علم حساب بالکل مختلف ہے۔ اس کے بغیر دنیا کی تسخیر نہیں ہو سکتی۔

(iii) طریقہ تدریس

طریقہ تدریس نہایت اہم ہے۔ مدارس میں ہماری علم کی تدریس بھی فرسودہ ہے۔ مدارس میں ذہن کے استعمال کی بجائے حافظے پر زور دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ عقل کے استعمال اور تخلیق کی طرف میلان نہیں ہے۔ جدید سکولوں میں سوال کرنے کو پسند کیا جاتا ہے۔ مدارس میں سوال کرنا

---

[1] ۔Ptolemy؛ بطلیموس (100ء-170ء) ایک مشہور یونانی ماہر فلکیات، جغرافیہ دان اور ریاضی دان تھا۔

انتہائی بے ادبی ہے۔ہم نے بہت سی احادیث کی غلط تفہیم کی روشنی میں سوال کرنا برا فعل بنا دیا ہے حالانکہ پورا قرآن مجید گواہ ہے کہ کائنات کے مظاہر (manifestations) کے بارے میں سوال کرنا سکھایا گیا ہے۔سوال علم کو جلا بخشتا ہے۔ یہ بے ادبی یا گناہ نہیں ہے بلکہ ثواب ہے۔

(iv) جدید زبانوں کی تدریس

ہمارے مدارس کے نظام تعلیم میں عربی و فارسی کے علاوہ کوئی زبان شامل نہیں ہے۔ فارسی بھی اب ختم ہوگئی ہے۔ البتہ عربی خوب پڑھائی جاتی ہے۔طرز تدریس ایسا ہے کہ عربی زبان کا عالم چند فقرے روانی سے نہیں بول سکتا۔ پورا زور صرف ونحو (گرائمر) کو یاد کرانے میں لگا دیا جاتا ہے حالانکہ جدید اداروں کے درجہ چہارم کے بچے خوب روانی سے انگریزی بولتے ہیں۔ مدارس میں کوئی جدید زبان نہیں پڑھائی جاتی۔ انگریزی، جرمن اور فرانسیسی وغیرہ کو کفر سمجھا جاتا ہے۔ میرے بچپن کے اساتذہ انگریزی پڑھنا کفر سمجھتے تھے۔

(v) مشکل زبان

ہماری تمام تصنیفات مشکل زبان میں ہیں۔جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نئی نسل کا رابطہ ہمارے پرانے ذخیرہ علم سے بالکل کٹ گیا ہے۔ارسطو (Aristotle, d. 322BC)، افلاطون (Plato, d. 348/347 BC) اور شکسپیئر (Shakespeare, d. 1616) کو ہم پڑھ لیتے ہیں کہ مغرب نے ان کو آجکل کی زبان میں منتقل کر دیا ہے۔ہم مشکل سے مشکل طرز تحریر کو علم کی شان سمجھتے ہیں چاہے کسی کی سمجھ میں آنہ آئے۔میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔

سورۃ الرحمٰن کی آیت :

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ[1]

(ہر آن وہ نئی شان میں ہے)

کی تفہیم پچھلی صدی کے ایک معروف عالم دین نے یوں کی ہے: صدور افعال لزوم بالذات ہے۔ میری رائے میں قرآن کی آیت تو سمجھ میں آسکتی ہے لیکن یہ تفہیم سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کی انتہائی ضرورت ہے کہ اردو میں لکھی جانے والی اعلیٰ اسلامی کتب کو آسان اردو میں ڈھالا جائے۔ عربی وفارسی کی کتابوں کا اردو ترجمہ کیا جائے تاکہ عام آدمی فائدہ اٹھا سکے۔

(vi) تحقیق

تحقیق کا تو ہمارے ہاں رواج ہی نہیں۔ پچھلے کئی سو سالوں سے تحقیق سے مراد کسی پرانے بزرگ کی کتاب کا حاشیہ لکھنا ہے یا پھر کسی کتاب کی شرح لکھنا ہے۔ کسی علمی موضوع پر نئے علوم کی روشنی میں تحقیقی کام بالکل ناپید ہے۔ ایک زمانے میں مجھے اسلام معیشت پڑھنے کا شوق ہوا۔ میں نے دنیا بھر کی کتب اکٹھی کیں۔ میری دیانتدارانہ رائے میں ایک بھی کتاب ایسی نہیں تھی جسے ٹیکسٹ بک کے طور پر کسی اچھی یونیورسٹی میں پڑھایا جاسکے۔ یہی حال قانون کا ہے۔ پچھلے پچاس برسوں میں اسلامی قانون پر چند اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں جبکہ مغرب میں ہر سال قانون کے ہر موضوع پر کئی نئی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ یہاں ہم یہ بات بتا کر خوش ہو جاتے ہیں کہ یہ کتاب اتنی پرانی ہے۔ اہل مغرب اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ یہ کتاب اسی سال چھپی ہے۔

---

[1] سورۃ الرحمٰن: آیت:29

ہر روز اہل مغرب نئے نئے حوالوں سے قرآن، حدیث، قانون اور ہمارے سماج پر تبصرہ کرتے ہیں۔ اول تو ہم تک اور ہمارے روایتی دینی طبقہ تک ان کی آراء پہنچتی ہی نہیں۔ اگر پہنچتی بھی ہیں تو کم از کم چوتھائی صدی بعد۔ وہ بھی اگر کسی درددل والے نے ترجمہ کر دیا تو۔ پھر ہم اس کا علمی وعقلی جواب دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ صرف اس کو اسلام دشمن لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں یا پھر بددعا کر دیتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس کا اثر زائل ہو جائے گا۔

ہمیں اندازہ ہی نہیں کہ اس زہریلے لٹریچر سے ہماری نئی نسل دین سے دور ہو رہی ہے۔ مجھے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ سے روز نئے نئے سوال سننے کو ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک واضح اقلیت دین سے محبت رکھتی ہے لیکن اہل دین سے نالاں ہے اور میری رائے میں بجا طور پر نالاں ہے۔ ہم ان کے ذہن کو نہیں سمجھتے۔ ہمیں ان کی تعلیم کا اندازہ نہیں۔ ان کی زبان ہمیں نہیں آتی۔ اس سے بڑھ کر ہمیں ان سے ہمدردی نہیں۔ اگر ہمیں ان سے ہمدردی ہوتی تو کوشش کرتے تاکہ وہ دین پر قائم رہیں یا دین میں پورے کے پورے داخل ہو جائیں۔

ہم ان کی شکل وصورت دیکھ کر لباس دیکھ کر ان کو گمراہ کہہ دیتے ہیں حالانکہ بہت سے ایسے ہوتے ہیں جن کے دل میں دین کا درد ہوتا ہے۔ ان میں کچھ نماز بھی کبھی کبھار پڑھ لیتے ہیں۔ یہ ہمارا فرض تھا کہ ہم اپنے آپ کو اس نسل کے لیے تیار کرتے۔ ہم اس کام میں مکمل طور پر ناکام ہوئے ہیں۔

ایک دفعہ میں کسی کام کے لیے انٹرویو کر رہا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی انٹرویو دینے آئی۔ اس نے بہت ہی مختصر لباس پہن رکھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آج کل کیا پڑھ رہی ہو؟ اس نے جواب دیا کہ رومیؒ کو پڑھ رہی ہوں۔ میں پریشان ہو گیا۔ مزید سوال کرنے پر اس نے بتایا کہ میں امریکہ

میں تھی۔ میں نے رومیؒ کا انگریزی ترجمہ خریدا۔ میں رومیؒ اس لیے پڑھ رہی ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کی بات کرتا ہے اور میں اللہ عزوجل سے محبت کرنا چاہتی ہوں۔ وہ لڑکی تو یہ بات کر کے چلی گئی لیکن میرا دل دہل گیا کہ جس کی شکل دیکھ کر، لباس دیکھ کر میں اسے بے دین اور بے حیا سمجھا تھا وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی تلاش میں ہے۔ وہ تو اللہ والی تھی۔ میں ہی بری رائے بنا کر گنہگار رہوا۔

ایک زمانے میں میرے ساتھ ایک نہایت ذہین لڑکی کام کرتی تھی۔ مسلمان تھی لیکن اس کی ساری تعلیم مغربی ممالک میں تھی۔ عمومی اعمال میں خاصی مغرب زدہ تھی لیکن اسلام کے بارے میں اکثر سوال کرتی رہتی تھی۔ لگتا تھا کہ اسلام کی روح کو جاننے کی طلب گار ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کی ذاتی زندگی کو جاننا چاہتی تھی۔ میں نے اس کی فرمائش پر اسے سیرت النبی ﷺ پر ابوبکر سراج الدین المعروف مارٹن لنگ[1] (Martin Lings, d. 2005) کی کتاب دی۔ کچھ مطالعہ اور طویل بحث وتحیث کے بعد وہ اللہ تعالیٰ اور حضور نبی کریم ﷺ پر باقاعدہ ایمان لے آئی۔ مجھے اکثر کہتی تھی کہ محمد ﷺ بن کر دکھاؤ (یعنی آپ ﷺ کے نقش قدم پر چل کر دکھاؤ)۔

یہ وہ نئی نسل ہے جس کے دل میں اسلام کی رمق تو ہے مگر وہ اپنے ماحول اور تعلیم کی وجہ سے اس سے دور ہے۔ موجودہ اسلامی ادب ان کے لیے مناسب نہیں۔ ان کے مسائل مختلف ہیں۔ ان کے سوال مختلف ہیں۔ ان کی سوچ کا انداز مختلف ہے۔ یہ نسل علما کی روایت پسندی سے سخت نالاں ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ ایسی حیران و پریشان نسل کو کون سنبھالے گا؟

---

[1]۔ Martin Lings؛ ابوبکر سراج الدین المعروف مارٹن لنگ (1909ء-2005ء) ایک انگلش مسلمان محقق، مصنف اور سکالر تھا۔ اس کی وجہ شہرت Muhammad: His Life Based on the Earliest Sources ہے۔

سید ابوالحسن علی ندویؒ[1] (d. 1999) کی اس رائے سے مجھے مکمل اتفاق ہے کہ امت مسلمہ کا اصل مسئلہ فکری انحطاط (decline) ہے۔ آپ خود سوچیں کہ حضرت ابن تیمیہؒ (d. 1328) اور شاہ ولی اللہؒ (d. 1762) کے درمیان کون سا مفکر ایسا ہے جس نے دین پر علمی لحاظ سے کام کیا ہو۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں مغرب کے تمام اہل علم، سائنسدان، فلسفی، ماہر معیشت پیدا ہوئے اور ہمیں ڈھونڈنے سے بھی کوئی نام نہیں ملتا۔ شاہ صاحب کے بعد یکھ لیں کوئی نظر نہیں آئے گا۔ عہد حاضر میں سرسید احمد خان[2] (d. 1898)، حضرت اقبالؒ (d. 1938) اور مولانا مودودیؒ (d. 1979)) کے نام سامنے آتے ہیں۔ سرسید احمد خان کو بہت سے علما بہت برا سمجھتے ہیں۔ حضرت اقبالؒ کو ہم نے آہستہ آہستہ قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن مودودی صاحبؒ کو ہمارے روایتی علماء ابھی تک ہم عالم ہی نہیں سمجھتے کہ اس کے پاس کسی مدرسہ کی ڈگری نہیں تھی۔

---

[1]۔ شیخ ابوالحسن علی ندویؒ المعروف بہ علی میاںؒ (1914ء-1999ء) ایک مشہور و معروف عالم دین، سکالر اور مصنف تھے۔ آپؒ کی مشہور تصنیف انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ اخوان المسلمین کے رہنما سید قطب نے لکھا تھا۔ آپؒ کو شاہ فیصل ایوارڈ سمیت مختلف اعزازات سے نوازا گیا۔ 1951ء میں آپؒ کے اعزاز میں بیت اللہ شریف کا دروازہ مسلسل دو دن تک کھلا رکھا گیا تا کہ آپؒ جس شخص کو چاہیے بیت اللہ شریف کے اندر لے جائیں۔

[2]۔ سر سید احمد خانؒ (1817ء-1898ء) برصغیر میں مسلم نشاۃ ثانیہ کے علمبردار تھے۔ انہوں نے مسلمانوں میں بیداری علم کی تحریک پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ سر سید احمد خان انیسیوں صدی کے مصلح اور رہبر تھے۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو جمود سے نکالنے اور انہیں باعزت قوم بنانے کے لیے سخت جدوجہد کی۔ سر سید نے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کا بیڑا اسوقت اٹھایا جب زمین مسلمانوں پر تنگ تھی اور انگریز اُن کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ وہ توپوں سے اڑائے جاتے تھے، سولی پر لٹکائے جاتے تھے، کالے پانی بھیجے جاتے تھے۔ اُن کے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی۔

میں علامہ محمد اسد (Leopold Weis, d. 1992) کے خطوط پڑھ رہا تھا۔ انہوں نے بہت دکھ سے لکھا ہے کہ پاکستان میں ایک خاص طبقہ نے ان کے خلاف تکفیری تحریک چلائی غالباً اس سے بددل ہوکر وہ مراکش چلے گئے۔ ان کی قرآن پاک کی تفسیر میری رائے میں عہد حاضر میں انگریزی اور اردو میں لکھی جانے والی مختصر تفاسیر میں سب سے بہتر ہے۔ ان کی بخاری شریف کی شرح اور دیگر کتب کمال کی ہیں۔ کچھ لوگ ان کو کافر یا مرتد سمجھتے ہیں کہ انہوں نے بعض معاملات پر روایتی فکر سے اختلاف کیا ہے۔

آپ سر سید احمد خان کو دیکھیں۔ جب ولیم میور[1] نے حضور نبی کریم ﷺ کی سیرت پر کتاب لکھی۔ جس میں اس نے غلط بیانی کی تو سر سیدؒ نے اپنی پوری جمع پونجی فروخت کردی اور ولایت چلے گئے۔ وہاں کئی سال بیٹھ کر اس کتاب کا جواب دیا۔ اس موضوع پر ان کی کتاب خطبات احمدیہ کمال کی کتاب ہے لیکن ہم ان کو مرتد یا نیچری کہتے ہیں۔ ہم نے ان کی چند آراء کی خاطر ان کی تمام خدمات پر پانی پھیر دیا ہے حالانکہ میں آپ کو ایسی آراء بہت سے علما قدیم کی کتب سے دکھا سکتا ہوں۔

امام بخاریؒ کو ان کے عہد کے علما برا بھلا کہتے تھے لیکن تاریخ نے ثابت کردیا ہے کہ امام بخاریؒ کی خلق قرآنی کے بارے میں مختلف رائے کے باوجود ہم ان کی کتاب صحیح بخاری کو قرآن پاک کے بعد سب سے صحیح کتاب مانتے ہیں۔

سر سیدؒ کی علی گڑھ تحریک جس نے ہندوستان میں مسلمانوں کی بقا میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ سر سید کی خطبات احمدیہ جو سیرت مصطفیٰ ﷺ پر ایک عالمانہ اور شاندار کتاب ہے جس کے لیے

---

[1] Sir William Muir؛ سر ولیم میور (1819ء-1905ء) ایک سکاٹش اسلامی مستشرق تھا۔

انہوں نے اپنی پوری جائیداد بیچ دی۔ ہمیں نظر نہیں آتی۔ اس لیے کہ ان کے کچھ خیالات ہماری روایتی فکر کے مطابق نہ تھے۔ نہ جانے ہمیں کیا ہو گیا ہے۔ ہم ذرہ بھر اختلاف برداشت نہیں کرتے۔ یہ ایک مطلقاً غیر علمی اور غیر عقلی رویہ ہے جو ہمیں علم دشمنی تک لے گیا ہے۔

مسلمان آج کل ایک قسم کے ذہنی فاقہ (intellectual starvation) کا شکار ہیں۔ وہ ذہنی غربت میں مبتلا ہیں۔ وہ حالات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔ ہم حقائق کا گہرا تجزیہ کرنے کی بجائے دوسروں پر الزام دھرتے رہتے ہیں۔ چیخ و پکار کرتے رہتے ہیں۔ غیروں کو موردالزام ٹھہراتے ہیں حالانکہ اصل مسئلہ ہمارا اپنا ذہنی افلاس ہے۔ ہم محنت نہیں کرتے۔ جان نہیں کھپاتے۔

(vii) تخصص

آپ تخصص (specialization) کو دیکھ لیں۔ آٹھ دس سال میں ہم درس نظامی پاس کر لیتے ہیں۔ ایک دو سال مزید لگا کر ہم اسلامی قانون کے مفتی بن جاتے ہیں۔ معاشیات، خاندانی معاملات، بینک، تجارت یعنی زندگی کے تمام معاملات پر اسلامی حوالے سے فتویٰ دیتے ہیں۔ جس سے اختلاف کفر سمجھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے قرآن مجید اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث وسیرت پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ تمام فقہاء کی آرا سے واقف ہیں اور اتنی مہارت رکھتے ہیں کہ زندگی کے کسی بھی مسئلہ پر ہم حتمی رائے دے دیں جو پوری امت پر لازم ہو۔ اہل مغرب کا رویہ اس سے بالکل الٹ ہے۔

آیئے ہم قانون ہی کی مثال لے لیں۔ چودہ سال میں بی۔ اے (B.A) ہوتا ہے۔ اس کے بعد

تین سال میں ایل ایل بی (L.L.B) ہوتا ہے۔اس کے بعد تین سے پانچ سال میں پی ایچ ڈی (Ph.D) ہوتی ہے۔ وہ بھی قانون کے کسی ایک شعبہ کے کسی ایک نکتہ پر۔ مثال کے طور پر اسلام کے قانون معاملات کے اندر قانون معاہدہ (contract) پر۔یعنی کسی ایک پہلو پر بلکہ پہلو کے بھی ایک پہلو پر۔اس کے بعد ڈگری یافتہ کسی یونیورسٹی میں سادہ لیکچرر بنے گا۔تیس سال کی شب وروز تحقیق وتدریس کے بعد وہ پروفیسر بنے گا۔اگر بیس سال کی اس تعلیم اور تیس سال کی تحقیق کے بعد اس سے قانون معاہدہ کے کسی اور پہلو کے بارے میں پوچھیں تو فوراً کہے گا کہ میں نہیں جانتا۔آپ کسی متعلقہ آدمی سے دریافت کریں۔ اسے یہ بات کہتے ہوئے ذرا بھر بھی ندامت محسوس نہیں ہوگی۔

ایک مدارس کے طالب علم ہیں کہ دس سال میں زندگی کے تمام معاملات کے تمام پہلوؤں پر تمام علم حاصل کر لیتے ہیں اور بہت اعتماد کے ساتھ فتویٰ (آخری رائے) دیتے ہیں۔عہد حاضر میں اس سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں اپنا رویہ عہد حاضر کے رویے کے مطابق کرنا ہوگا۔

ہماری سوچ عجیب ہے۔اگر ہم سے کوئی بات پوچھے تو ہم فوراً کہتے ہیں کہ تمام معاملات کا جواب ہمارے آئمہ کرامؒ نے دے دیا ہے۔ہم یہ نہیں سوچتے کہ بلاشک امام جعفر صادقؒ[1] (d. 765)،

---

[1]۔امام جعفر صادق بن محمد باقرؒ (702ء–765ء) حضرت زین العابدینؒ بن حسین بن علی رضی اللہ عنہ کے پوتے تھے۔آپؒ نے زین العابدینؒ سے علم وفیض حاصل کیا۔آپؒ کا شمار تبع تابعین میں ہوتا ہے۔اکابرین امت حضرت امام مالکؒ وامام ابوحنیفہؒ نے آپؒ سے احادیث روایت کی ہیں۔آپؒ کی والدہ محترمہ سیدہ ام فروہؒ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پڑپوتی بھی تھیں۔

امام ابوحنیفہؒ (d. 772)، امام شافعیؒ (d. 819)، امام حنبلؒ (d. 855)، امام مالکؒ[1] (d. 795) اور امام تیمیہؒ (d. 1328) غیر معمولی لوگ تھے۔ غیر معمولی قانون دان تھے۔ انہوں نے قانون کے بنیادی اصول بہت شان سے بیان کیے ہیں۔ لیکن ان شاندار اصولوں کی عہد حاضر میں تطبیق چاہیے۔ بہت سے معاملات اس وقت تھے ہی نہیں جو عہد حاضر میں پیدا ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر جہاز رانی (shipping) کا اربوں روپے کا سالانہ کاروبار ہے۔ انشورنس کا کھربوں روپے کا کاروبار ہے۔ ہوائی جہازوں کا کھربوں روپے کا کاروبار ہے۔ کمپیوٹر نے دنیا ہی بدل دی ہے۔ ان میں سے کسی شعبے سے متعلق میں نے کوئی کتاب اسلامی قانون کے حوالے سے نہیں دیکھی۔

ہمیں پدرم سلطان بود (میرا باپ بادشاہ تھا) والی رٹ چھوڑ دینی چاہیے۔ زمانہ بہت آگے جا چکا ہے۔ اب غاروں کا زمانہ نہیں ہے۔ یہ ٹریڈ سنٹر کا زمانہ ہے۔ یہ گھوڑے کا زمانہ نہیں، راکٹ کا زمانہ ہے۔ یہ تیر کا زمانہ نہیں، ایٹم بم کا زمانہ ہے۔ یہ جذبات کا نہیں، دلیل کا زمانہ ہے لیکن ہم ہیں کہ اپنی روش پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں۔ تبدیلی تو بعد کا عمل ہے۔ سوچیں گے تو تبدیل ہوں گے۔

(viii) کتب کی کمی

ہمارے آباء (ancestors) کی کتابیں بھی ہمارے پاس نہیں ہیں۔ پاکستان کے کتب خانوں میں ابن سینا (Avicenna, d. 1037)، الزہراوی (al-Zahrawi, d. 1013)،

---

[1] حضرت مالک بن انسؒ (711ء-795ء) شیخ الاسلام کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اہل سنت کی نظر میں وہ فقہ کے مستند ترین علماء میں سے ایک ہیں۔ فقہ مالکی اہل سنت کے ان چار مسالک میں سے ایک ہے جس کے پیروان آج بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ آپؒ کی کتاب المؤطا احادیث کی مستند کتاب شمار کی جاتی ہے۔

عمر خیام (Omar Khayyam, d. 1131)، فارابی (al Farabi, d. 950)، ابن نفیس[1] (Ibn Nafees, d. 1288) اور ابوالہیثم (Abu al-Haytham, d. 1040) کی کتابیں نہیں ملتیں۔ ان کے تراجم بلکہ اصل مخطوطات آپ کو آکسفورڈ (Oxford) میں ملتے ہیں۔ لندن (London) میں ملتے ہیں۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں عرض کروں کہ سیرت پاک کی اکثر بڑی کتابیں (سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد اور سیرت ابن اسحاق وغیرہ) ہالینڈ (Holland) کی لیڈن یونیورسٹی (Leidon University) کے طالب علموں نے تلاش کر کے چھاپی ہیں۔ اگر آج مجھے قدیم مسلم فلسفہ، ادب وغیرہ پر تحقیق کرنا ہو تو میں دیوبند[2] یا بریلی[3] کے مدارس نہیں جا سکتا۔ وہاں کچھ بھی نہیں ملے گا بلکہ مجھے لیڈن (Leiden) اور آکسفورڈ (Oxford) جانا پڑے گا۔ وہاں یہ کتب بہت اچھی شکل میں ملیں گی۔ آپ جامعہ اشرفیہ، جامعہ نعیمیہ (لاہور کے مدارس) کے کتب خانے دیکھ لیں۔ اس سے زیادہ کتابیں تو میں نے مغرب میں کئی پروفیسروں کے گھروں میں دیکھی ہیں۔

ہماری کوئی اچھی اسلامی لائبریری نہیں ہے۔ اسلامی قانون پر کتابیں ملتی ہی نہیں۔ لنکنز ان

---

[1]۔ ابوالحسن علاء الدین علی بن ابی الحزم المعروف ابن نفیس (1213ء–1288ء) مشہور مسلمان طبیب اور فلسفی تھے۔

[2]۔ دارالعلوم دیوبند ہندوستان کے شمالی صوبہ اتر پردیش کے ضلع سہارنپور کے ایک قصبہ دیوبند میں واقع ہے۔ اس مدرسہ کو ہندوستان میں برطانوی سامراجیت کے دور استبداد میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تحریک کو جاری رکھنے، مسلمانانِ ہند کے جداگانہ تشخص کو برقرار رکھنے، مسلک حنفیہ کی مسند تدریس کو منور رکھنے، دشمنان اسلام، مشرکین ہندوستان اور عیسائی مبلغین اسلام پر اعتراضات کا جواب دینے کے لیے 1866ء میں مولانا قاسم نانوتویؒ نے قائم فرمایا۔ اسلامی تعلیمات کی تدریس کے لیے الازہر یونیورسٹی، مصر کے بعد اس درس گاہ کو عالمگیر شہرت نصیب ہوئی۔

[3]۔ بریلی ہندوستان کے شمالی صوبہ اتر پردیش کے ضلع رائے بریلی میں واقع ہے جس کی وجہ شہرت وہاں پر موجود دارالعلوم منظر الاسلام ہے۔

(لندن) میں، میں نے 1997ء میں ایک بار احسان (equity) کے قانون پر کتب تلاش کیں۔ جب میں نے کمپیوٹر میں احسان لکھا تو اس نے اپنی سکرین پر 241 کتابوں کی فہرست، ان کے مصنفین کے نام، چھاپے خانے کا نام اور صفحات کی تعداد وغیرہ دس سیکنڈ میں بتا دی۔ ہمارے بہترین مدارس میں نہ تو اتنی کتب ہیں اور نہ ہی ان کو ڈھونڈنے کا نظام ہے۔ علم کہاں سے آئے گا؟

اب تو تحقیق مزید آسان ہوگئی ہے۔ بازار میں ستر روپے میں کمپیوٹر کی ایک سی ڈی (CD) ملتی ہے۔ جس میں چار قاریوں کی آواز میں پورے قرآن کی تلاوت ہے۔ چار تفاسیر ہیں۔ صحاح ستہ (حدیث کی چھ بڑی کتب) ہیں۔ فقہ کی کئی کتابیں ہیں۔ سیرت پر کئی کتب ہیں۔ تلاش اتنی آسان ہے کہ آپ وضو کا لفظ لکھیں تو قرآن کی تمام متعلقہ آیات، تمام کتب احادیث میں موجود متعلقہ احادیث، فقہ کی کتب سے آراء دس سیکنڈ میں آپ کے سامنے آجائیں گے۔ اس کے بعد آپ سب کو پڑھ کر جو چاہیں رائے بنائیں۔ یہ تلاش اگر میں دارالعلوم کراچی کی لائبریری میں کرنا چاہوں تو مجھے ایک ماہ (26 لاکھ سیکنڈ) لگیں گے۔ یہی فرق ہمارا اور مغرب کا ہے۔ انٹرنیٹ نے تو معاملہ مزید آسان کر دیا ہے۔

دوسری مثال لیں۔ امریکہ کی ایک یونیورسٹی، یونیورسٹی آف مینی سوٹا (University of Minnesota) کی انٹرنیٹ کی ایک ویب سائٹ پر حقوق انسانی سے متعلق چھ ہزار سے زائد دستاویزات ہیں۔ جو ہمیں مکمل مفت مل جاتی ہیں۔ دیکھیں قانون اور سیاست کے ایک پہلو یعنی حقوق انسانی پر ایک یونیورسٹی نے ہوا میں اتنی کتابیں ہم سب کے لیے مفت رکھی ہیں۔

میں جب علماء سے اس مسئلے پر بات کرتا ہوں تو سادہ سا جواب ملتا ہے کہ ہمارے وسائل نہیں ہیں۔ مجھے اس دلیل سے بالکل اتفاق نہیں ہے۔ مسجد پر اگر ہم ایک چھوٹا سا مینار بنالیں۔ چار بڑے مینار نہ بنائیں تو اسی مسجد میں ایک چھوٹی سی لائبریری قائم ہوسکتی ہے۔ آپ جانتے ہیں

کہ مسجد نبوی کے مینار نہ تھے۔ بیت اللہ کے مینار نہ تھے۔ یہ بعد میں شناخت کے لیے بنے ہیں۔ کیا شناخت کے لیے ایک چھوٹا سا خوبصوت سا مینار کافی نہیں ہے؟ حج ایک فرض ہے۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ہر سال حج پر جاتے ہیں۔فرض حج کے علاوہ ہر سال اربوں روپے ہم حج وعمرہ پر صرف کرتے ہیں کیا اس رقم کا استعمال لائبریری بنانے پر ہوسکتا ہے؟ حالانکہ تحصیل علم بہت اعلیٰ عبادت ہے۔ہم عالم کی ایک رات عابد کی سو راتوں سے بہتر سمجھتے ہیں[۱]۔اس کو بھی چھوڑ دیں۔ آپ ایک سال میں غیر ضروری مذہبی جلسے جلوسوں پر اٹھنے والے اخراجات کا جائزہ لیں تو وہ کروڑوں میں ہوں گے جو ایک شاندار لائبریری بنانے کے لیے کافی ہیں۔

ہمارے بڑوں نے انتہائی نامناسب حالات میں بھی تحقیق کی ہے۔کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تیس جلدوں پر محیط کتاب المبسوط امام سرخسیؒ[۲] نے جیل کے اندر ایک کنویں میں بیٹھ کر لکھی ہے[۳]۔نہ شاندار مدرسہ اور نہ ہی لائبریری۔سرمایہ تھا تو فقط عشق کا تھا۔جس کا چراغ آج بھی

۱۔کنز العمال۔جلد پنجم: رقم:4278 (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک عالم، عابد پر ستر درجے فضیلت رکھتا ہے اور ہر دو درجوں کے درمیان تیز رفتار گھوڑے کی سو سالہ مسافت کے برابر ہے)

۲۔شمس ائمہ محمد بن احمد ابوبکر امام سرخسیؒ (متوفی 438 ہجری) ایک مشہور ومعروف حنفی سکالر تھے جن کا تعلق ایران کے شہر سرخس سے تھا۔اسی شہر کی نسبت سے سرخسی مشہور ہو گئے۔آپؒ کی مشہور کتاب المبسوط فی الفقہ ہے۔

۳۔فرغانہ کے حاکم نے اپنی ایک کنیز کو آزاد کر کے عدت سے پہلے ہی اس سے نکاح کر لیا۔امام سرخسیؒ نے اس پر اعتراض کیا تو حاکم وقت نے انہیں ایک کنواں نما گھڑے میں قید کر دیا۔آپؒ کے شاگردوں کو اس واقعے کا بہت زیادہ دکھ ہوا۔انہوں نے اپنے استاد سے وابستگی کے لیے درخواست کی کہ ہم روزانہ اس کنویں کے منہ پر آجایا کریں گے۔آپؒ ہمیں کچھ املا کرا دیا کریں۔چنانچہ آپؒ نے اس کنویں سے اپنی عظیم کتاب المبسوط فی الفقہ املا کرانی شروع کی اور علم کی تاریخ کا یہ منفرد شاہکار کنویں نما قید خانے سے املا کروائی جو 30 ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔

روشن ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خُونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خُونِ جگر کے بغیر[1]

5۔ سائنس کی تعلیم

ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آج ہم مسلمان سائنسی علم میں کس مقام پر ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے مقابلے میں ہماری درس گاہیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہماری کتب نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہماری لیبارٹریاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مسلمانوں کی آبادی ایک ارب بیس کروڑ کے قریب ہے جبکہ یہودیوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ ہے۔ مسلمان ممالک کے سائنسدانوں نے آج تک سائنس میں صرف تین اور مسلمانوں نے دو نوبل پرائز حاصل کیے ہیں جبکہ یہودیوں نے 151 نوبل پرائز حاصل کیے ہیں۔

ہمارے پاس کوئی بھی سائنسدان ایسا نہیں جسے عالمی سطح پر احترام سے دیکھا جاتا ہو۔ اگر ہمیں سائنس پڑھنا ہو تو ہم مغرب کی یونیورسٹیوں کے وظائف تلاش کرتے ہیں۔ اگر کوئی تحقیق کرنا ہو تو مغرب کی لیبارٹریوں میں پناہ لیتے ہیں۔ کوئی جدید معلومات لینی ہو تو مغرب کے رسالوں کو کھنگالتے ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ سائنس اور اس کی تعلیم کے بارے میں اپنی فکر کو درست کریں۔ سائنس کو اپنی میراث سمجھیں (جیسا کہ تیسرے باب سے واضح ہے)۔ سائنس تو ہم نے متعارف کرائی تھی۔ ہم نے پھیلائی تھی۔ اب ہم اس کو مغربی علم سمجھتے ہیں۔ ہمارے دیندار لوگ سائنس کی تعلیم چھوڑ کر

۱۔ مسجد قرطبہ؛ بال جبریل از محمد اقبالؒ

مدرسے میں پڑھنا کمال سمجھتے ہیں حالانکہ یہ اسلام کی واضح تعلیمات کے خلاف ہے۔ ہمیں سائنس کی تعلیم کو اتنا ہی اہم سمجھنا چاہیے جتنا کہ فقہ کی تعلیم کو سمجھا جاتا ہے۔

ہمیں چاہیے کہ اپنے دینی نصاب میں سائنسی تعلیم کو شامل کریں۔ سائنس کو اعلیٰ تعلیم کے لیے تعلیمی ادارے اور تحقیق گاہیں بنائیں بلکہ ایک سائنسی ماحول پیدا کریں جہاں تدریس ہو۔ تحقیق ہو۔ تذکیر ہو۔ تسخیر کائنات کی باتیں ہوں۔ چاند و مریخ پر جانے کی باتیں ہوں۔ روح و مادہ کو جوڑنے کی سعی ہو۔ انسانی فلاح کے لیے نئی ایجادات ہوں۔ مہلک اور ناقابل علاج بیماریوں کا علاج دریافت ہو۔ انسانی زندگی اور طویل ہو۔ عمومی صحت اور بہتر ہو۔ ماحول مزید بہتر ہو۔ یہ سب ہم پر فرض ہے۔ انسانیت کا قرض ہے۔ یہی انسانی فلاح ہے۔ یہی اسلام ہے۔

میری علما کرام سے گزارش ہے کہ مسلمانوں میں سائنسی تعلیم کا شعور و شوق پیدا کریں۔ تورا بورا[1] کے بعد اگر ہم اس کو ضروری نہیں سمجھیں گے تو ہم بھی وہیں دفن ہو جائیں گے۔ امت کو ترغیب دیں کہ غیر ضروری تقاریب (چاہے وہ مذہبی ہوں یا سماجی) پر خرچ کم کریں اور بچت کو سائنس کی ترویج میں لگائیں۔ ہر سال اربوں روپے مذہبی جلسے جلوسوں پر خرچ کیے جاتے ہیں۔ جن کا اسلام کی حقیقی روح سے شاید کوئی تعلق نہیں ہے۔

کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ علما یہ فتویٰ دیں کہ ایک غیر ضروری مذہبی رسم پوری کرنے کی بجائے سائنس کے ایک طالب علم کی ایک ماہ کی فیس ادا کر دی جائے۔ دوسرا حج اور عمرہ کرنے کی بجائے ایک طالب علم انجینئر کے ایک سال کا خرچ ادا کر دیا جائے؟ مجھے یقین ہے کہ ایسا کرنے

۱۔ مشرقی افغانستان میں موجود پہاڑی سلسلے کو تورا بورا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں موجود غاروں کو طالبان اپنے ہیڈ کوارٹر کو طور پر استعمال کرتے تھے۔ امریکہ نے افغانستان پر حملے کے دوران ان پہاڑوں پر انتہائی خطرناک ہتھیاروں کا استعمال کیا۔

سے اللہ پاک سادہ رسوم بھی قبول کر لے گا۔ حج وعمرہ بھی قبول کر لے گا۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق بھی خوش ہوگی۔ مسلمان سائنس بھی پڑھ لیں گے۔

6۔ برتر اخلاق

مسلمان عمومی طور پر اخلاقی پستی کا شکار ہیں۔ یہ اخلاقی گراوٹ اس وقت اور زیادہ واضح طور پر نظر آتی ہے جب ہم کہتے ہیں کہ ہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام ہیں۔ جن کے بارے میں صحیح کہا گیا ہے:

بَلَغَ	العُلیٰ	بکمَالِہِ
کَشَفَ	الدُجی	بجمالِہِ
حَسُنَت	جمِیع	خِصَالِہِ
صَلُوا	عَلیہِ	وآلِہِ

(انسانی عظمت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں اپنے کمال تک پہنچی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسن وکمال کی روشنی سے اندھیرے چھٹ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تمام اعلیٰ انسانی خوبیاں تھیں۔ اللہ عزوجل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل پر سلام بھیجتے ہیں)

ولایت میں جب میں پڑھتا تھا تو قانون کی جماعت میں اساتذہ ہمیں سابق نظائر (precedents) پڑھاتے تھے۔ جو اعلیٰ عدالتوں نے مختلف مقدمات میں فیصلے دیئے تھے۔ عجب اتفاق ہے کہ اخلاقی گراوٹ والے اکثر شائع شدہ مقدمات ہم لوگوں (مسلمانوں) کے ہوتے تھے۔ میں اکثر اس پر سوچتا تھا اور اندر اندر سے شرمندہ ہوتا تھا۔ لیکن کسی سے اس کا ذکر بھی

نہیں کرسکتا تھا۔ دھوکہ، فراڈ، اعتماد شکنی وغیرہ کی اکثر نظیریں ہمارے لوگوں کی وجہ سے بنی تھیں حالانکہ اخلاق اسلام کا سب سے اونچا معیار ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واضح ارشاد مبارک ہے کہ تم میں سے سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں[1]۔ ہمیں درج ذیل چیزوں پر ذرا غور کرنا چاہیے:

(i) عاجزی

اسلام عاجزی سکھاتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد پاک ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندے اللہ پاک کی زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں[2]۔ اس عاجزی کی خاص وجہ ہے۔ جب مسلمان یہ جان لیتا ہے کہ کائنات کی اصل اللہ عزوجل ہے۔ یہ زندگی عارضی ہے۔ آگے جا کر اپنے اعمال و اخلاق کا حساب دینا ہے۔ اس سے مسلمان نرم خو اور مہربان بن جاتا ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ سے نرمی چاہتے ہو تو اللہ پاک کی مخلوق پر نرمی کرو۔ اگر مخلوق پر رحم نہیں کرو گے تو تم پر بھی رحم نہیں کیا جائے گا۔ تم مسلمان کی مدد کرو گے، اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا۔ تم مسلمان کی مصیبت دور کرو گے تو اللہ پاک قیامت کے روز تمہاری مصیبت دور کرے گا۔ یہ تعلیمات اس کو نرمی و رحم سکھاتی ہیں۔ تنگ نظری ختم کرتی ہیں۔

---

[1]۔ صحیح مسلم۔ جلد سوم: رقم: 1532 (حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سب سے بہتر وہ آدمی ہے، جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں)

[2]۔ سورۃ الفرقان: آیت: 63 (وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا: اور رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں)

(ii) اعلیٰ اخلاق

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ لوگ آپ سے اچھا سلوک کریں تو ان سے اچھا سلوک کرو۔ اگر وہ آپ سے برا سلوک کریں تب بھی ان سے اچھا سلوک کرو[1]۔ حدیث ہے کہ کیا میں تم کو دنیا و آخرت کا بہترین اخلاق نہ بتاؤں؟ جو تم سے تعلق توڑے تم اس سے جوڑو۔ جو تم کو محروم رکھے تم اسے دو۔ جو شخص تم پر ظلم کرے اس کو تم معاف کر دو[2]۔

ان احادیث سے واضح ہے کہ ہمارا اخلاق باہمی (bilateral) نہیں ہے بلکہ یک طرفہ (unilateral) ہے۔ ہم نے اچھائی اس لیے نہیں کرنی کہ کوئی آدمی ہمارے ساتھ اچھائی کر رہا ہے۔ بلکہ اس وقت بھی اچھائی سے جواب دینا ہے جب دوسرے ہم سے زیادتی کر رہے ہوں۔

---

[1]۔ مسند احمد۔ جلد چہارم: رقم: ۸۳۰۰ (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے کچھ رشتے دار ہیں، میں ان سے صلہ رحمی کرتا ہوں لیکن وہ مجھ سے قطع رحمی کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہوں لیکن وہ میرے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں، میں ان سے درگذر کرتا ہوں لیکن وہ میرے ساتھ جہالت سے پیش آتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا! اگر واقعتاً حقیقت اسی طرح ہے جیسے تم نے بیان کی تو گویا تم انہیں جلتی ہوئی راکھ کھلا رہے ہو اور جب تک تم اپنی روش پر قائم رہو گے اللہ کی طرف سے تمہارے ساتھ ایک مددگار رہے گا)

[2]۔ کنز العمال۔ جلد دوم: رقم: 3588 (حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میری حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات ہوئی تو میں نے جلدی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ تھام لیا یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے میرے ہاتھ کو تھام لیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عقبہ! کیا میں تمہیں دنیا اور آخرت کے سب سے افضل اخلاق نہ بتاؤں؟ جو تم سے ناتا توڑے تم اس سے جوڑو، جو تمہیں محروم رکھے تم اسے عطا کرو اور جو تم پر ظلم کرے تم اسے معاف کر دو)

ہم نے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رضا، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت اور اپنی فلاح کے لیے کرنا ہے۔ اگر ہم یہ جذبہ رکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کرنا ہے تو دوسروں کی برائیاں بھی ہمیں ان سے اچھائیاں کرنے سے نہیں روکیں گئیں۔ یہی اخلاق کی تکمیل ہے۔ جس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس دنیا میں بھیجا گیا ہے[۱]۔

(iii) معافی

ہمیں حکم ہے کہ قدرت کے باوجود معاف کردو۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: اے میرے رب تیرے بندوں میں تیرے نزدیک سب سے زیادہ معزز بندہ کون ہے؟ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: وہ شخص جو قدرت پانے کے باوجود معاف کردے[۲]۔

اسلام نے ہمیں معافی سکھائی ہے۔ ابوجہل اسلام کا بدترین دشمن تھا۔ اس کا بیٹا عکرمہ بن ابی جہل بھی باپ کے نقش قدم پر چلتا تھا۔ فتح مکہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کا خون بھی معاف کردیا تھا۔ وہ مکہ سے بھاگ گیا اور یمن میں پناہ گزیں ہوگیا۔ اس کی اہلیہ ام حکیم بنت حارث پہلے مسلمان ہو چکی تھی۔ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں اپنے خاوند کے لیے معافی کی درخواست کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ درخواست قبول کر لی۔ وہ یمن جا کر اپنے خاوند کو واپس لائیں۔ عکرمہ

۱۔ موطا امام مالک۔ جلد اول: رقم: 1544 (حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے)

۲۔ مشکوۃ شریف۔ جلد چہارم: رقم: 1043

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کرلیا۔ جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محفل میں آنے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ساتھیوں سے ارشاد فرمایا: عکرمہ بن ابی جہل تمہارے پاس آرہا ہے۔اس کا باپ اسلام کا سخت ترین دشمن تھا۔تم اس کے سامنے اس کے باپ کو برا بھلا مت کہنا۔ مردہ کو برا کہنے سے زندہ کو تکلیف ہوتی ہے[1]۔ سبحان اللہ! کیا احترام آدمیت ہے۔ اپنے مظلوم اصحاب سے کہا جارہا ہے کہ تمہارے بدترین ظالم دشمن کا بیٹا آرہا ہے۔ اس کے باپ کے خلاف بات کرکے اس کو تکلیف نہ دینا۔ یہ وہ کشادہ دلی تھی۔ یہ وہ عظمت کردار تھی جس کی وجہ سے مشرق ومغرب نے اسلام قبول کرلیا۔عکرمہ نے اپنی باقی زندگی اسلام کے لیے وقف کردی۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لے جارہی تھیں۔ ھبار بن اسود نے آپ رضی اللہ عنہا کے اونٹ کو نیزہ مارا۔جس سے اونٹ زخمی ہوگیا اور بلک پڑا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اونٹ سے گر پڑیں۔ اس وقت وہ حمل سے تھیں۔ ان کا حمل ضائع ہو گیا۔ اس کے بعد وہ بقیہ زندگی بیمار رہیں۔ اس ظالم ھبار نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر معافی طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو بغیر کسی شرط کے معاف فرما دیا[2]۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محسن چچا تھے۔ وحشی بن حرب اور ہند زوجہ ابوسفیان نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بہت زیادتی کی۔ وحشی نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔ اس نے فتح مکہ کے بعد مدینے میں حاضر ہوکر معافی مانگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاف فرما دیا۔ ہند نے غزوہ احد میں

---

[1]۔ دیکھیے کنز العمال۔ جلد ہفتم: رقم:1335

[2]۔ سیرت حلبیہ از علامہ علی بن برہان الدین حلبیؒ۔ جلد سوم۔ صفحہ نمبر 279

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا سینہ چیرا اور جگر نکال کر چبایا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو بھی معاف کر دیا[1]۔

مجھے ذاتی طور پر اسلامی تاریخ کا ایک واقعہ بہت ہی عجیب لگتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر ایک جھوٹی اور بے بنیاد تہمت لگائی گئی۔ اس غیر اخلاقی وغیر انسانی حرکت میں ایک صحابی حضرت مسطح رضی اللہ عنہ بھی شریک تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی لاڈلی بیٹی تھی۔ مسطح رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک غریب رشتہ دار تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کی غربت کے سبب اس کا ماہانہ خرچ اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ جب حضرت مسطح رضی اللہ عنہ نے یہ حرکت کی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بجا طور پر اس کا وظیفہ بند کر دیا۔

آپ سوچیں کہ اول تو وظیفہ دینا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قانونی ذمہ داری نہ تھی بلکہ آپ رضی اللہ عنہ نے از سر خود اخلاقی بنیادوں پر اس پر یہ کرم کر رکھا تھا۔ دوسرے بے گناہ اور لاڈلی بیٹی پر تہمت کے بعد ان کے پاس ایک اخلاقی جواز بھی تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ن جب غم وغصہ کی وجہ سے اس کا وظیفہ بند کیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوٓا أُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۗ أَلَا تُحِبُّوْنَ أَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۗ

---

[1]۔ دیکھیے صحیح بخاری۔ جلد دوم: رقم: 1296 اور کشف الباری اردو شرح صحیح بخاری از حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ۔ جلد ہشتم: صفحہ نمبر 499-500

وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ [1]

(اور تم میں سے جو لوگ اچھی مالی حالت رکھتے ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے رشتہ داروں، محتاجوں اور اللہ کی راہ میں وطن چھوڑنے والوں کی مدد نہ کریں گے۔ ان کو معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کرنا چاہیے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تم کو معاف کر دے اور اللہ عزوجل معاف کرنے والا مہربان ہے)

کیا اعلیٰ انسانی تعلیمات ہیں؟ کیا اخلاقی معیار ہے کہ گالیاں کھا کر بھی اپنے دشمن پر کرم جاری رکھنا ہے۔

(iv) غصہ پر ضبط

غصہ اخلاق کا قاتل ہے۔ غصہ میں آدمی اخلاقی اصولوں کو بھول جاتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے کیا خوب کہا ہے:

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا
ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غصہ کو خوف خدا ہی روک سکتا ہے۔ مومنین کی صفت ہے کہ جب انہیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر

1۔ سورۃ النور: آیت 22

دیتے ہیں[1]۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاف فرمایا: پہلوان وہ نہیں جو حریف کو پچھاڑ دے۔ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے[2]۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حل بھی بتایا کہ جب غصہ آئے تو چپ ہو جاؤ[3]۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ ان کا ایک خدمت گار ان کے لیے گرم گرم چائے لایا۔ جو اس خدمتگار کی کوتاہی کی وجہ سے بزرگ کے پاؤں پر گرگئی۔ اس بزرگ کا پاؤں جل گیا۔ کرب و غصے کے عالم میں انہوں نے اس خدمتگار کی طرف دیکھا۔ وہ سخت پریشان و پشیمان تھا۔ اس نے موقع کی نزاکت سے قرآن مجید کا سہارا لیا اور کہا: **والکاظمین الغیط** (وہ غصہ پی جاتے ہیں)۔ بزرگ خاموش ہو گئے۔ چہرے سے کرب و غصے کی علامات ختم ہو گئیں۔ خدمتگار نے اگلا جز پڑھا: **والعافین عن الناس** (وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں)۔ بزرگ نے فرمایا جا! میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ خدمتگار نے آیت کا اگلا حصہ پڑھا: **واللہ یحب المحسنین** (اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)۔ بزرگ نے فرمایا کہ جا! میں نے تمہیں آزاد کیا۔ یہ ہے اسلامی اخلاق کہ پاؤں جلانے کے بدلے میں آزادی بخش دی جائے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے نصیحت فرمائیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: غصہ نہ کیا کرو۔ اس نے کئی بار

---

[1]۔ سورۃ الشوریٰ: آیت: 37 (وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ)

[2]۔ صحیح بخاری۔ جلد سوم: رقم: 1067

[3]۔ مصنف ابن ابی شیبہ۔ جلد ہفتم: رقم: 2009 (حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تجھے غصہ آجائے تو خاموش ہو جا)

عرض کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہی فرماتے رہے کہ غصہ نہ کیا کرو[1]۔

ہماری حالت خاصی توجہ طلب ہے۔ ہمیں غصہ بہت آتا ہے۔ مزاج میں برہمی و درشتی ہر وقت رہتی ہے۔ جتنا بڑا عالم اور جتنا بڑا صوفی ہوتا ہے۔ اس کا جلال اتنا زیادہ ہوتا ہے۔ جتنا بڑا آفیسر، اتنا زیادہ تکبر و غصہ۔

میں لڑکپن میں قرآن پاک کی تفسیر پڑھ رہا تھا۔ جب کوئی چیز سمجھ میں نہیں آتی تھی تو میں کسی مدرسہ میں کسی عالم دین کے پاس جا کر سوال کرتا۔ جواب سن کر اگر پھر کوئی سوال کر دیا تو بس حضرت صاحب کو جلال آ جاتا تھا۔ یہی حال اعلیٰ سرکاری ملازمین کا ہے۔ جتنا بڑا آفیسر اتنا زیادہ بدتہذیب۔ ایک آفیسر نے مجھے ایک دن بہت فخر سے بتایا حالانکہ وہ ریٹائرڈ تھے اور ماشاء اللہ مذہبی ہو گئے تھے کہ جب وہ ڈی سی آفس میں سپریٹینڈنٹ (superintendent) تھے تو فلاں (ایک وزیر کا صاحب کا نام لے کر) کو میں نے کبھی اپنے دفتر میں کرسی پیش نہیں کی تھی۔ میں نے سخت بے ادبی کی اور کہہ دیا کہ غالباً یہ آپ کی بداخلاقی تھی۔ اسی کے ٹیکس سے تمہیں تنخواہ ملتی تھی۔ اس کے کام کے لیے سرکار نے تجھے ملازمت دی تھی۔

اخلاق ہمارا ہتھیار ہے۔ اخلاق سے ہم نے دین پھیلایا تھا۔ اب اس حسن سے ہم محروم ہو گئے ہیں۔ ہمارے جسم کے پھولوں سے اخلاق کی خوشبو اڑ چکی ہے۔ انسان کی عظمت کا معیار اس کی تعلیم نہیں۔ اس کی دولت نہیں۔ اس کا عہدہ نہیں بلکہ اخلاق ہے۔ عاجزی ہے۔ سادگی ہے۔ خیرخواہی ہے۔

۱۔ صحیح بخاری۔ جلد سوم: رقم: 1069

ہمیں اخلاقی تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ میں نوجوان تھا۔ مولانا مودودیؒ[1] (d. 1979) صاحب کا ریڈیو پاکستان سے انٹرویو سن رہا تھا۔ یہ انٹرویو انہوں نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے دیا تھا۔ ان سے سوال کیا گیا کہ ان کی تمام عمر اسلام کے احیاء کے لیے گزری ہے۔ مسلمانوں کی ترقی کے لیے گزری ہے۔ آپ تجربے کی روشنی میں کیا سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ کس چیز کی ضرورت ہے؟ مولانا نے فوراً جواب دیا کہ مسلمانوں کو اخلاق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ مودودی صاحبؒ کی زندگی کا یہ حاصل تھا۔ یقیناً انہوں نے سو فیصد صحیح فرمایا ہے۔ اخلاق کے بغیر ہم بانجھ ہیں۔ اس پر گہرے سوچ و بچار کی ضرورت ہے۔

7۔ حقوق انسانی

جنگ عظیم دوئم کے بعد سے حقوق انسانی کی تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ 1948ء میں اقوام متحدہ نے حقوق انسانی کا منشور[2] تیار کیا۔ 1976ء میں سیاسی[3] اور معاشی حقوق[4] کے عہد نامے عمل میں

---

[1]۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903ء-1979ء) ایک مشہور عالم دین اور مفسر قرآن اور جماعت اسلامی کے بانی تھے۔ ان کا شمار بیسوی صدی کے موثر ترین اسلامی مفکرین میں ہوتا ہے۔ ان کی فکر، سوچ اور تصانیف نے پوری دنیا کی اسلامی تحاریک کے ارتقا میں گہرا اثر ڈالا۔

[2]۔ Universal Declaration of Human Rights

[3]۔ International Covenant on Civil and Political Rights

[4]۔ International Covenant on Economic, Social and Cultural Rights

آئے۔ 1981ء میں عورتوں کے خلاف امتیازات کے خاتمے کا دستور[1] نافذ العمل ہوا۔ 1990ء میں بچوں کے حقوق کا دستور[2] عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ سینکڑوں اعلانات، دستور اور قوانین (مختلف موضوعات) پر نسل انسانی نے اتفاق کیا۔ حقوق انسانی کی اس ساری تحریک کو ہم اہل اسلام مغرب کی سازش اور ہتھکنڈہ سمجھتے ہیں۔ اس کے سبب ہم نے ایک منفی اپروچ اختیار کر لی ہے جو سخت نقصان دہ ہے۔

مذہب انسانی احترام سکھاتا ہے۔ اسلام نے روز اول سے انسان کو اپنی تعلیمات کا مرکز بنایا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام و ابلیس کی کہانی اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ انسان صاحب شرف ہے۔ مسجود ملائکہ ہے۔ توریت، زبور، انجیل اور قرآن پاک کا مقصد انسانیت کی فلاح و ترقی ہے۔ دنیا میں انصاف قائم کرنا ہے۔ قانون کی حکمرانی لانا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانیت کے شرف کی تکمیل کی۔ میثاق مدینہ اور خطبہ حجۃ الوداع اس کا مظہر ہیں۔ میثاق مدینہ انسانی تاریخ کا پہلا تحریری دستور ہے اور خطبہ حجۃ الوداع حقوق انسانی کا پہلا باقاعدہ چارٹر ہے۔

میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے تین مثالیں دینا چاہتا ہوں:

(الف) فتح مکہ سے ذرا قبل نجران کا ایک وفد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بات چیت کرنے مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وفد کے خیمے مسجد نبوی کے صحن میں لگائے۔ خیمے مسجد سے ذرا باہر بھی لگ

---

[1]۔ The Convention on the Elimination of All Forms of Discrimination against Women (CEDAW)

[2]۔ Convention on the Rights of the Child

سکتے تھے۔ وہ لوگ عیسائی تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان عیسائیوں کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا[1]۔ ہمارا یہ حال ہے کہ کسی دوسرے فرقے والے کو اپنی مسجد میں نہیں گھسنے دیتے۔ مسجد دھوتے ہیں کہ ناپاک ہوگئی ہے۔ پھر بھی ہم کہتے ہیں کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام ہیں۔ کیا ہم کسی عیسائی یا یہودی کو اپنی مسجد میں آنے دیتے ہیں؟ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کمزور تھے؟ بالکل نہیں۔ اسلام نے آدھے عرب پر قبضہ کر لیا تھا اور نجران والے تو کمزور تھے۔ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا وہ صرف اور صرف اخلاق محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے کیا۔ اس میں کوئی مصلحت نہیں تھی۔ خالص اخلاق تھا۔ احترام آدمیت تھا۔ کیا ہم اپنی اقلیتوں سے یہی سلوک کرتے ہیں۔ ہماری تو ریاست ہے۔ یہاں عیسائی مغلوب ہیں لیکن ہمارا سلوک بھیانک ہے جو لوگ قادیانی نہیں بھی ہوتے ہم ان کو زبردستی قادیانی بنا دیتے ہیں۔ ان کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ میں آپ کو اس ضمن میں دو مثالیں دینا چاہتا ہوں۔

(i) میں 1990ء میں عمرکوٹ (سندھ) میں تعینات تھا۔ ایک مذہبی گروہ نے جلسہ کرنا چاہا۔ مذاکرات ہوئے۔ شرائط طے پا گئیں۔ جلسہ ہوا تو تمام شرائط کو پامال کر دیا گیا۔ میں نے اس پر قانون کے مطابق کاروائی کی۔ کچھ علما گرفتار ہوئے۔ میں خود جیل میں جا کر ان سے ملا۔ ان کے اچھے کھانے کا انتظام کیا۔ جائے نماز پیش کی۔ بے گناہ یا کم گناہگار فوراً رہا کر دیئے۔ چند روز کے بعد میرے خلاف پورے سندھ میں پوسٹر لگ گئے کہ میں قادیانی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا یہ ہوا کہ عمرکوٹ کے علما نے اپنے خطبات میں اس کی تردید کی۔ اس لیے کہ وہ مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے۔ سب سے بڑی مقامی مسجد کے خطیب اسلامی یونیورسٹی میں میرے شاگرد رہ چکے تھے۔ میرا سوال یہ ہے کہ

[1] دیکھیے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم از شبلی نعمانی جلد دوم صفحہ نمبر 401

(ii) دوسری مثال ایک اعلیٰ سرکاری عہدیدار کی ہے۔ وہ خود صاحب علم تھا۔ پانچ وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا تھا۔ اس کی تمام اولاد اعلیٰ ترین دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی عمل وعلم سے مزین ہے۔ ایک سیاستدان نے اس کی دیانتداری سے تنگ آکر ایک بار لکھ دیا کہ وہ قادیانی ہے۔ اس کے بعد بہت سی مذہبی جماعتیں اس کو قادیانی لکھنے لگیں۔ آپ اس کی تکلیف کا اندازہ کہ معاشرہ میں اس کی کیا حالت ہوگی؟ کیا یہی اسلامی تعلیم ہے کہ آپ بلاتحقیق کسی شریف آدمی کی زندگی حرام کر دیں؟ مجھے اس آفیسر کو قادیانی کہنے والی جماعت کے کچھ اکابرین کچھ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مل گئے۔ میں نے نہایت درد سے گلہ کیا۔ ان کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔ اس صاحب سے کہیں کہ وہ اس کی تردید کر دیں۔ میں نے کہا: **لا حول ولا قوۃ**۔ وہ پریشان ہوگئے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے آپ کے جواب سے نہایت دکھ ہوا ہے۔ یہ آپ کا کام تھا کہ آپ تحقیق کرتے۔ سنی سنائی بات پر عمل نہ کرتے۔ ثبوت کا بوجھ ہر ضابطے میں آپ پر ہے۔ آپ عالم دین کہلانے کے باوجود اس ملزم شخص سے کہہ رہے ہیں کہ وہ اپنی صفائی پیش کرے۔ میں پوری فصاحت و بلاغت استعمال کر کے ان اکابرین کو یہ بنیادی بات نہ سمجھا سکا کہ ہر آدمی احترام کے لائق ہے۔ ہمیں ثبوت کے بغیر لوگوں کی زندگیاں تباہ نہیں کرنی چاہیں۔ میں نے انہیں فیض احمد فیض (d. 1984) کی ایک نعت کا یہ شعر سنایا:

آتش فشاں ز قہر و ملامت زبانِ شیخ
از اشکِ تر ز دردِ غریباں ردائے توا

ا۔ نعت؛ غبار ایام از فیض احمد فیض

(اے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! غریبوں کے درد میں روتے روتے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادر آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی لیکن شیخ کی زبان سے غصہ وملامت کی آگ نکل رہی ہے)

(ب) آیئے میں آپ کو سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوسری مثال دوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد نبوی میں اپنے خادموں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ایک بدو آیا اور اس نے مسجد نبوی کے صحن میں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اٹھ کر بھاگے تاکہ اس کو روکیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سختی سے فرمایا کہ اسے تنگ نہ کرو۔ پیشاب کرنے دو۔ اس کی مجبوری ہوگی[1]۔ قربان جاؤں یہ تھے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ ہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام کہلاتے ہیں لیکن دوسرے مسلمان کو اپنی مسجد میں نماز نہیں پڑھنے دیتے۔ کیا نسبت ہے؟ کیا قربت ہے؟ کیا بعد المشرقین ہے؟ تو کجا و من کجا۔

(ج) سیرت سے تیسری مثال سنیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک راستے پر سے گزر رہے تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ساتھ تھے۔ راستے میں ایک کتیا اپنے بچوں کو دودھ پلا رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہمیں راستہ چھوڑ دینا چاہیے ورنہ کتیا پریشان ہوگی۔ بچے دودھ نہیں مکمل کر سکیں گے۔

سبحان اللہ! یہ تھے وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جن کو ہم مانتے ہیں۔ یہ وہ اخلاق تھا جس نے عرب وعجم کو جیت لیا۔ ایک ہم ہیں کہ دعویٰ تو محبت کا کرتے ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی تعلق نہ ہے۔ ہماری صورت حال خسارے والی ہے۔ حضرت اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:

---

[1] ۔صحیح بخاری۔ جلد اول: رقم: 221 (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے مسجد میں کھڑے ہو کر پیشاب کر دیا، تو لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو اور اس کے پیشاب پر ایک ڈول پانی ڈال دو۔ اس لئے کہ تم لوگ نرمی کرنے کے لئے بھیجے گئے ہو، سختی کرنے کیلئے نہیں)

بمصطفیٰ ﷺ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی، تمام بولہبی است[1]

(مصطفیٰ ﷺ تک اپنے آپ کو پہنچاؤ کہ وہی اصل دین ہیں اگر تم آپ ﷺ تک نہ پہنچے تو یہ ابولہبیت ہوگی)

8۔ عورتوں کے حقوق

عورت آدھی انسانیت ہے۔ دنیا میں کم وبیش پچاس فیصد خواتین ہیں لیکن بدقسمتی سے ہمارا رویہ ان کے بارے میں اسلامی نہیں ہے بلکہ روایتی معاشرتی ہے۔ جو اصولاً بھی غلط اور عہد حاضر کے تقاضوں کے بالکل برعکس ہے۔

عورت کے ضمن میں ہم عیسائی نظریات سے بہت متاثر ہیں۔ عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کی ابتدائی حکم عدولی کی وجہ اماں حوا علیہا السلام تھیں۔ اس غلط فکر کی وجہ سے عورت برائی وفساد کی جڑ بنی۔ ہر بری شے عورت سے منسوب کی جانے لگی۔ عورت کی اس اخلاقی کم تری کا اظہار ہر انسانی فکر اور رویے سے ظاہر ہونے لگا۔ عہد حاضر میں عیسائیوں نے حقوق انسانی کی تحریک کی وجہ سے عورتوں کے بہت سے حقوق مان لیے لیکن ہماری فکر پر ابھی تک ان اسرائیلیات (یہود و نصاریٰ کی کتابوں کی روایات) کا اثر ہے۔ حالانکہ قرآن مجید بہت واضح ہے۔ سورۃ بقرہ میں ارشاد ہے کہ (شیطان) نے ان دونوں کو غلط راستہ دیکھایا[2]۔

۱۔ حسین احمد؛ ارمغان حجاز از محمد اقبالؒ

۲۔ سورۃ البقرۃ: آیت: 36 (فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ)

یعنی حضرت حوا علیہا السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کو گمراہ نہیں کیا بلکہ دونوں اکٹھے شیطان کی باتوں میں آ گئے۔ اس آیت کی وجہ سے ہمیں انسانی برابری کا سبق ملتا ہے۔ لیکن ہم نے بھی عورت کو برائی اور جنس کا مجسمہ سمجھ لیا ہے۔ ظلم یہ ہے کہ نئی حقوق نسواں کی تحریک بھی ہمارے ہاں افراط و تفریط کا شکار ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واضح ارشاد ہے کہ تم میں سے سب سے بہتر وہی ہے جو اپنے اہل وعیال سے بہتر ہے[1]۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سلوک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ملاحظہ فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی ان کے گھر بغیر دستک کے تشریف نہیں لے گئے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جب بھی تشریف لائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی میں ان کی سہیلیوں کو عید پر تحفے بھیجتے رہے[2]۔ اس سے زیادہ اپنی بیوی کی محبت اور احترام کیا ہو سکتا ہے۔

ایک ہم ہیں کہ ہر لمحے کہتے ہیں کہ عورت جوتی برابر ہے۔ عورت فتنہ ہے۔ اس ضمن میں ہم نے بہت ایسی روایات کا سہارا لیا ہے جو جرح و تعدیل[3] کے اصولوں پر پورا نہیں اترتیں۔ بعض احکام

---

[1]۔ جامع ترمذی۔ جلد اول: رقم: 1169

[2]۔ دیکھیے جامع ترمذی۔ جلد اول: رقم: 2106

[3]۔ جرح سے مراد حدیث کے راویوں کے وہ عیوب بیان کرنا جن کی وجہ سے ان کی عدالت ساقط ہو جاتی ہے اور ان کی روایت کردہ حدیث رد کر دی جاتی ہے اور تعدیل سے مراد حدیث کے راوی کے عادل ہونے کے بارے میں بتلانا اور حکم لگانا کہ وہ عادل یا ضابط ہے۔

خاص حالات کے لیے تھے۔ ہم نے انہیں عمومی بنا لیا ہے۔ جو قانون اور اصول تعبیر کے تمام مروجہ اصولوں کے خلاف ہے لیکن ہم اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔

ایک سے زائد شادیوں سے متعلق قرآن بہت واضح ہے:

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ○ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا[1]

(یتیموں کو ان کا مال دے دو۔ ان کے اچھے مال سے اپنا برا مال تبدیل نہ کرو۔ ان کے مال میں اپنا مال ملا کر مت کھاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اگر تمہیں ڈر ہے کہ تم یتیموں کے معاملے میں انصاف نہیں کر سکو گے تو (ان سے نکاح نہ کرو) ان سے نکاح کرو جو تمہیں پسند آئیں (ان کے علاوہ دوسری) عورتوں سے دو دو، تین تین اور چار چار اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی۔۔۔۔۔اس سے تم ایک کی طرف جھکنے سے بچو گے)

حضرت سعید بن جبیرؒ[2] (d. 714)، قتادہؒ[3] اور دیگر تابعینؒ کی رائے یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے

۱۔ سورۃ النساء: آیت: 2-3

۲۔ حضرت سعید بن جبیرؒ (665ء-714ء) معروف تابعی، مفسر، محدث اور فقیہی تھے۔ ان کی فقہی آرا کو اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کے ہاں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

۳۔ حضرت قتادہ بن دعامہؒ پیدائشی نابینا معروف تابعی مفسر، محدث عصر اور فقیہی تھے۔

کہ جس طرح تم یتیموں کے حقوق کے بارے میں خوف زدہ ہو۔ اس طرح عورتوں کے حقوق کے بارے میں بھی فکرمند ہونا چاہیے۔

(i) اس سے ثابت ہوا کہ اصل مسئلہ یتیم بچیوں کے حقوق کا بیان ہو رہا تھا۔ ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے ان سے شادی کے نام پر ظلم کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

(ii) دوسری شرط یہ ہے کہ اگر تم انصاف کر سکو۔ یہ آیت تعدد ازواج (polygamy) کے جواز کو عدل (justice) کی شرط سے مشروط (conditional) کرتی ہے۔ جو شخص عدل کی شرط پوری نہیں کرتا مگر ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کے جواز سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دغابازی کرتا ہے۔ حکومت اسلامی کی عدالتوں کو حق حاصل ہے کہ جس بیوی یا جن بیویوں کے ساتھ وہ انصاف نہ کر رہا ہو ان کی دادرسی کریں[1]۔

(iii) تیسرا پہلو یہ ہے کہ واضح کیا جا رہا ہے کہ ایک ہی بہتر ہے تاکہ تم ایک کی طرف جھک کر برائی کے مرتکب ہو گے اور یہ انصاف کے خلاف ہوگا۔

ہم نے اس آیت کو اس کے تناظر سے باہر نکال لیا اور انصاف کی شرط کو بھی بھول گئے۔ شادی کو عیاشی کا ذریعہ بنا لیا۔ یہ حکم نہیں تھا جو اہل اسلام پر فرض تھا بلکہ ایک خاص تناظر میں ایک مشروط رخصت تھی۔ یہ عمومی حکم نہیں تھا بلکہ خاص حالات میں ایک گنجائش تھی۔

آیئے حضور نبی کریم ﷺ کی سیرت کو ملاحظہ کریں (آپ ﷺ کی اپنی شادیوں کو ہم یہاں

---

[1] تفہیم القرآن از مولانا مودودیؒ بحوالہ سورۃ النساء: آیت: 2-3

موضوع نہیں بنا سکتے۔ اس لیے کہ قرآن پاک میں واضح ہے کہ یہ رعایت صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تھی) بخاری شریف نے حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے منبر پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے تھے کہ ہشام بن مغیرہ کی اولاد میں سے ایک نے مجھ سے یہ اجازت مانگی کہ وہ اپنی لڑکی کا نکاح علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب سے کر دیں۔ تو میں تو اجازت نہیں دیتا۔ ہرگز اجازت نہیں دینا۔ کبھی اجازت نہیں دیتا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ابوطالب کا بیٹا میری بچی کو طلاق دے دے اور ان کی بیٹی سے نکاح کر لے۔ بات یہ ہے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا میرا ایک ٹکڑا ہے جو اس کو برا لگے مجھے بھی لگتا ہے۔ جس چیز سے اس کو تکلیف ہو، مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے[1]۔

سوال یہ ہے کہ کیا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صرف اپنی بیٹی کے جذبات کی فکر تھی یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانی فطرت کے بارے میں ارشاد فرما رہے تھے۔ میرا ایمان ہے کہ نبی علیہ السلام صرف اپنی بیٹی کے لیے کوئی حکم جاری نہیں کر سکتا و گرنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ نہ فرماتے کہ میں فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا اگر وہ چوری کرتیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پاک سے یہ بات واضح ہے کہ دوسری شادی عمومی معاملہ نہیں ہے۔ یہ دولت کے اظہار یا ہوس رانی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اصولی اور انسانی مسئلہ ہے۔

اس طرح عورت کی گواہی کا مسئلہ ہے۔ خاص شرائط اور خاص تناظر والی ہدایات کو عمومی قانون بنا دیا گیا ہے:

---

[1] صحیح بخاری۔ جلد سوم: رقم:218

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ[1]

(اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک دوسرے سے میعاد مقرر پر قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور لکھنے والے کو انصاف سے لکھنا چاہیے اور کاتب لکھنے سے انکار نہ کرے جیسے اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا ہے۔ پس اسے لکھ دینا چاہیے اور جس کے ذمے حق ہو وہ لکھوائے اور اپنے اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور اصل میں سے کچھ کم نہ کرے۔ ہاں، جس کے ذمے حق ہے اگر وہ نادان یا کمزور یا لکھوانے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوا دے اور تم اپنے میں سے دو مرد گواہ کر لو اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جنہیں تم گواہوں میں سے پسند کرو تا کہ ایک کی بھول چوک کو دوسری یاد کرا دے اور گواہ جب بلائے جائیں تو وہ انکار نہ کریں اور قرض جس کی مدت مقرر ہے خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ لکھنے میں سستی نہ کرو)

عہد حاضر میں جب عورتیں مالی معاملات میں برابر کی شریک ہیں۔ ان کے بھولنے کا خطرہ نہیں تو

---

[1] سورۃ البقرۃ: آیت:282

ان کی گواہی عمومی طور پر آدھی کیسے ہوگئی۔ قرآن مجید واضح ہے کہ اس طرح کی گواہی کا محل تب ہے جبکہ مالی معاملات تحریر کیے جا رہے ہوں اور وہ مستقبل سے متعلق ہوں اور عورت کے بھولنے کا خطرہ ہو۔ تب دو عورتیں گواہ بنیں گی۔ اس کا سادہ مطلب یہ ہوا کہ یہ ہدایات ان معاملات کے بارے میں نہیں ہوگی جو مستقبل کے مالی معاملات کے بارے میں نہ ہوں۔ دوسرے اگر عورت کے بھولنے کا خطرہ نہیں تو پھر بھی یہ ہدایت نہیں ہوگی۔ اس واضح حکم کے باوجود ہم عورت کو آدھا کہتے ہیں۔ مالی معاملات سے دور سیدھی سادی عورت اور جدید تعلیم یافتہ بینکر میں ہم فرق نہیں کرتے۔ اس رویے سے اسلام پر حرف آ رہا ہے۔

یہی حال پاکستان میں نافذ حدود کے قوانین کا ہے۔ وہ بہت جلدی میں لکھے گئے تھے۔ خاص طرح کی دینی تعبیر کے تحت لکھے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے بعض اوقات زنا بالجبر کا شکار ہونے والی عورت پر بھی حدود کا مقدمہ بن جاتا ہے۔ یہ بات چند سال پہلے زعفران بی بی کیس میں فیڈرل شریعت کورٹ نے واضح کی کہ یہ غلط ہے۔ ہمیں حدود اللہ اور حدود آرڈی نینس میں فرق کرنا چاہیے۔ حدود کو قائم رکھتے ہوئے حدود آرڈی نینس پر غور کرنے میں ہرج نہیں ہے۔ چند سال پیشتر اس غلطی کو دور کر دیا گیا ہے مگر اس پر بہت سے علما نے اعتراض کیا ہے۔

ہم نے عورت کو سوسائٹی سے باہر کر دیا ہے۔ وہ زندگی کے معاملات سے بھی باہر ہے۔ ظلم تو یہ ہے کہ ہم نے اس کو مسجد سے بھی باہر کر دیا ہے تاکہ وہ نماز باجماعت سے بھی جائے۔ عید سے بھی جائے اور مسجد میں خیر کی بات سننے کے موقع سے بھی محروم ہو جائے۔ ہم نے ایران، ترکی اور مغرب میں پورے حجاب کے ساتھ خواتین کو کام کرتے دیکھا ہے۔ اس شان وحیا کے ساتھ کہ کسی مرد کو ان کی طرف بری نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن مسلمان ممالک میں ہم نے مرد وعورت

کی بے جا تفریق کر دی ہے۔ حیا کے دائرہ میں بھی ہم عورتوں کو کام نہیں کرنے دیتے۔

اس کے آسان حل بھی ہو سکتے تھے۔ مثال کے طور پر پرائمری تعلیم میں صرف خواتین اساتذہ ہو سکتی تھیں۔ وہ شفقت مادری کی بدولت بچوں کو بہتر تعلیم دے سکتی ہیں۔ میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ عہد حاضر میں جب انسان بیدار ہے۔ تعلیم عام ہے۔ حقوق نسواں کی تحریک زوروں پر ہے۔ ہمیں اپنے رویوں کو بدلنا چاہیے۔ عورتوں سے متعلق ہم اپنی موجودہ فکر کا دفاع نہیں کر سکتے۔

9۔ فکری غلامی سے نجات

ہم ذہنی غلامی کا شکار ہیں۔ مذہبی طبقہ ماضی کا غلام ہے۔ جدید طبقہ مغرب کا غلام ہے۔ مذہبی طبقہ پانچ سو سال پہلے کے ذہنی فریم ورک میں رہتا ہے جبکہ جدید طبقہ مغرب کو ہی تہذیب و علم کا منبع (fountain) سمجھتا ہے۔ اس ذہنی غلامی کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے فکری اجتہاد اور علمی تحقیق چھوڑ دی ہے۔ مغرب فکر و تحقیق میں امام بن گیا۔ اس لیے اچھائی اور برائی کا معیار بن گیا۔ ہم سوتے رہے اور مغرب نے سفر جاری رکھا۔ اب مغرب قلم اور تلوار دونوں صورتوں میں غالب ہے۔ ہمارے مغلوب اور آرام پرست ذہنوں نے مغرب کو حق و ترقی کا معیار مان لیا۔ یہ ایک انتہا ہے۔ مذہبی طبقہ دوسری انتہا پر ہے۔ ان کے نزدیک مغرب سے آنے والی ہر شے کفر ہے۔ گمراہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مغربی فلسفہ و سائنس نے دہریت (atheism)، الحاد (apostasy) اور مادہ پرستی (materialism) کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

مذہبی طبقہ بھی عیسائی پادریوں (clergy) کی تاریخ دہرا رہا ہے۔ یورپ میں جب نشاۃ ثانیہ[1] (Renaissance) شروع ہوئی تو پادریوں نے ان نئے نظریات کو اپنے غلط نظریات (جو قدیم یونانی فلسفہ وحکمت پر قائم تھے) کے خلاف سمجھا۔ پادریوں کے نظریات کھوکھلے تھے۔ اس لیے انہوں نے نئے نظریات کو کفر سمجھ کر دبانے کی کوشش کی۔ مذہبی عدالتیں (inquisitions) قائم کی گئیں۔ جنہوں نے نئی علمی تحریک کے لوگوں کو سخت وحشیانہ سزائیں دیں۔ نئی علمی تحریک اس ظلم سے نہ دبی۔ اس لیے کہ وہ عقلی تھی اور عہد کے تقاضوں کے مطابق تھی۔ فتح اس نئی تحریک کی ہوئی اور اہل مذہب کی غلط روش کے سبب مذہب کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

اصل میں تو یہ جنگ نئی فکر کے لیڈروں اور پادریوں کے درمیان تھی۔ چونکہ پادری مذہب کے نام پر یہ جنگ لڑ رہے تھے اس صورت حال نے آزادخیالی اور مذہب کے درمیان جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ یہی صورت حال کم وبیش ہماری ہے۔ ہمارا مذہبی طبقہ بھی عیسائی پادریوں کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔

ہمیں بہت مشکل کام درپیش ہیں:

(i) ہمیں مغرب سے آنے والی ہر شے کو کفر سمجھنا چھوڑ دینا چاہیے۔ اسلام کے اس سنہری اصول کی روشنی میں کہ خذ ما صفیٰ دع ما کدر (اچھی شے قبول کر لیں اور بری شے چھوڑ دیں)۔ ہمیں فلٹر لگانے چاہییں۔ اچھے وبرے میں فرق کرنا چاہیے۔ مغرب کی اچھی چیزوں (محنت، دیانت، علم وتحقیق کی جستجو، حقوق انسانی کا احترام، فلاحی ریاست، جمہوری اقدار اور مستقبل کی طرف میلان وغیرہ)

---

[1] نشاۃ ثانیہ (Renaissance) قرون وسطیٰ میں یورپ سے اٹھنے والی ایک تحریک تھی جو 14ویں سے 17ویں صدی تک جاری رہی۔ اس کی ابتداء اٹلی سے ایک ثقافتی تحریک کے طور پر ہوئی پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے یورپ تک پھیل گئی۔

کو قبول کرنا چاہیے۔ حکمت و دانائی ہماری گمشدہ متاع ہے۔ جہاں سے ملے، لے لینی چاہیے[۱]۔

(ii) ہمیں ذہنی غلامی سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔ مغربی فکر و عمل پر ناقدانہ نظر ڈالنی چاہیے۔ مغرب چراغ راہ ہوسکتا ہے۔ اس کو منزل نہ بنائیں۔ مغرب کی روش میں جو مذہب دشمنی اور حیوانیت ہے اس کو سمجھیں۔ اپنی اقدار پر اعتماد کرنا سیکھیں۔ ظاہری چمک دمک سے متاثر ہونا چھوڑ کر حقیقت کی گہرائی کو دیکھیں کہ کیا انسان واقعی خوش ہوا ہے یا جدید تہذیب نے اس کو مزید غم زدہ اور پریشان حال بنا دیا ہے۔

(iii) ہمیں فکر کا امام (leader) بننا ہوگا۔ فکر و تہذیب کا رخ متعین کرنا ہوگا۔ یہ انتہائی مشکل کام ہے۔ اس لیے کہ ایک تو ہم کمزور ہیں۔ دوسرے ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں۔ تیسرے فی الحال تو ہم زمانے سے بھی پیچھے ہیں۔

لیکن تاریخ میں ایسا ہوتا رہا ہے کہ کمزور غالب آجاتے ہیں۔ اسلام کے عہد اول میں روم و یونان غالب تھے۔ فارس (ایران) غالب تھا۔ ہم نے کمزوری کے باوجود ان سے قیادت لے لی تھی۔ اب بھی ہمیں اتنی اندرونی طاقت حاصل کرنا ہوگی کہ ہم غلامی کے مدار (orbit) سے نکل کر امامت کی کھلی فضا میں آئیں۔ قرآن پاک میں واضح ہے کہ

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ[۲]

---

[۱]۔ کنز العمال۔ جلد ہشتم: رقم: 4285 (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حکمت کی بات مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے۔ لہٰذا اسے جہاں بھی پائے وہی اس کا مستحق ہے)

[۲]۔ سورۃ آلِ عمران: آیت: 140

(دن لوگوں اور قوموں کے درمیان پھرتے رہتے ہیں)

غالب مغلوب بن جاتے ہیں اور مغلوب غالب بن جاتے ہیں۔شرط یہ ہے کہ ہمیں کچھ زندگیاں وقف کرنا ہوں گی۔ کچھ جوانیاں لٹانا ہوں گی۔ اندھیروں میں چراغ جلانا ہوں گے۔ علما و اہل دانش کا کام ہے کہ وہ غلامی کے خدوخال واضح کریں۔قوم کو اور بالخصوص نوجوانوں کو ترغیب دیں کہ نقش ونگار دیر میں خون جگر تلف نہ کریں۔اپنی خودی نہ بیچیں بلکہ اپنی خودی میں ڈوب جائیں۔ اخلاقی قوت حاصل کریں کہ اصل فتح اخلاقی قوت کی ہی ہوتی ہے۔

10۔ تصوف کی اصلاح

اسلام کے روحانی پہلو کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔انسانیت روحانیت کی تلاش میں ہے۔نئی مسلم نسل اسلام کی ظاہرداری سے نالاں ہے۔وہ اسلام کی روح چاہتی ہے۔عام طور پر اسلام کے روحانی پہلو کو تزکیہ نفس یا تصوف کہتے ہیں۔

اسلام کا اصل مقصد بندے کو اس کے رب سے جوڑنا ہے۔ اس کا کچھ حصہ ظاہری شریعت (قانون) سے متعلق ہے اور کچھ حصہ باطنی اخلاقیات یا روحانیت سے۔ جسے تصوف یا احسان بھی کہا جاتا ہے۔شریعت بنیادی فریم ورک عطا کرتی ہے تا کہ انسان بھٹکنے سے بچ جائے لیکن زیادہ اخلاقی ترقی کا دارومدار انسان کی اپنی روحانی طلب پر ہے۔جتنی طلب ہوگی اتنی ہی زیادہ ترقی ہوگی۔تصوف روحانی طلب وترقی سے بحث کرتا ہے۔

صوفیاء نے خدا سے خوف کی بجائے محبت کا درس دیا ہے۔ ان کے نزدیک سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 54 مشعل راہ ہے کہ

يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ

(خدا ان کو محبوب رکھتا ہے اور وہ خدا کو محبوب رکھتے ہیں)

خدا سے محبت پر زور دینے کی وجہ سے انہوں نے خدا کی مخلوق سے بھی محبت کا درس دیا۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ[1] کا مشہور قصہ علامتی طور پر مفید ہے۔ ان کے ایک مرید کہیں سفر سے آئے تو وہاں کی سوغات کے طور پر قینچی لائے۔ آپؒ نے فرمایا کہ تم میرے لیے کاٹنے کی چیز لائے ہو۔ اگر تحفہ لانا ہی تھا تو سوئی دھاگہ لاتے کہ وہ جوڑنے کے کام آتا۔ صوفیا کی یہی خصوصیت تھی جو دین کی اشاعت کا سبب بنی۔ اس محبت کے درس کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں رقابت (rivalry) کم ہوگئی۔ اس میل جول سے لوگ اسلام سے متاثر ہوئے اور اسلام میں داخل ہوئے[2]۔

مشہور انگریزی شاعر Hunt نے 1834ء میں حضرت ابو بن ادھمؒ[3] (Abou Ben Adhem, d.

---

[1] حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ (1188ء-1280ء) برصغیر میں چشتیہ سلسلے کے عظیم صوفی بزرگ تھے۔ آپؒ کا مزار پاک پتن، پاکستان میں ہے۔

[2] فکر اسلامی از وحید الدین خاں۔ صفحہ نمبر 131

[3] حضرت ابراہیم بن ادھمؒ (718ء-782ء) ایک مشہور صوفی بزرگ تھے۔

(782 کے حوالے سے اس مسئلہ پر خوبصورت نظم لکھی ہے۔ جس میں اس بات کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے محبت کرنے والوں سے اللہ محبت کرتا ہے۔

Abou Ben Adhem

Abou Ben Adhem - may his tribe increase-

Awoke one night from a deep dream of peace,

And saw, within the moonlight in his room,

Making it rich, and like a lily in bloom,

An angel writing in a book of gold

Exceeding peace had made Ben Adhem bold,

And to the presence in the room he said:

What writest thou? The vision raised its head

And with a look made allo of sweet accord,

Answered, The names of those who love the Lord.

And is mine one? Said Abou. Nay, not so,

Replied the angel. Abou spoke more low,

But cheerly still, and said, I pray thee, then,

write me as one who loves his fellow men.

The angel wrote and vanished. The next night

It came again, with a great wakening light,

And showed the names whom love of God had blest,

And lo! Ben Adhem's name led all the rest.

ابو بن ادہمؒ

اللہ تعالیٰ اس کی جماعت کی تعداد بڑھائے

اک روز گہری نیند سے بیدار ہوا

اور چاند کی روشنی سے اپنے حجرے کو منور دیکھا

اس کا حجرہ چمبیلی کی کلیوں کی طرح بھرا ہوا تھا

اک فرشتہ سنہری کتاب میں لکھ رہا تھا

پُر سکون ماحول نے ابو بن ادھمؒ کی ہمت بندھائی

اور حجرے میں موجود فرشتے سے پوچھا

تم کیا لکھ رہے ہو؟ فرشتے نے سر اٹھایا

اور آپؒ پر محبت بھری نگاہ ڈالی
اور جواب دیا، ان لوگوں کے نام جو خدا سے محبت کرتے ہیں
ابو بن ادہمؒ نے پوچھا: کیا ان میں میرا نام بھی ہے؟
فرشتے نے جواب دیا کہ نہیں
ابو بن ادہمؒ نے دھیمی لیکن خوشی کی آواز میں کہا
میں تم سے گزارش کرتا ہوں
میرا نام ان میں لکھ لو جو اس کے بندوں سے محبت کرتے ہیں
فرشتے نے لکھا اور غائب ہوگیا
فرشتہ اگلی رات پھر آیا
اب وہ نیند سے بیدار کر دینے والی روشنی کے ساتھ آیا
اور ان کو وہ نام دکھائے جن کو اللہ تعالیٰ کی محبت کی سند ملی تھی
اور اس فہرست میں ابو بن ادہمؒ کا نام سب سے اوپر تھا۔

ہمارے ہاں تصوف اللہ پاک کی محبت کے لیے اللہ تعالیٰ کی کائنات وانسانیت سے تعلق بڑھانے کی بجائے ترک دنیا کا سبق دینے لگا حالانکہ اصل تصوف دنیا کے بے اعتدالانہ (immoderate) استعمال کے ترک کی تعلیم دیتا تھا۔ اس غلط تصوف کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم دنیا پر اضمحلال (exhaustion) طاری ہونے لگا۔ حضرت اقبالؒ کے بقول مسلمانوں کے زوال کے

اسباب میں سقوط بغداد کے بعد غلط تصوف کا حصہ ہے[1]۔

جس زمانے میں مغرب میں علوم فطرت میں ترقی ہو رہی تھی۔ ہم لذت سکر (intoxication) میں رہتے رہے۔ ہم مجموعی طور پر عالمی عمل سے بیگانہ رہے۔ ہمارے تصوف نے کائنات میں غور و فکر کی بجائے خواب اور کشف پر زور دیا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ صوفیوں نے براہ راست لوگوں سے کہا کہ تم سائنس سے دور رہو بلکہ غلط صوفیانہ تصورات سے ہمارے اندر جو مزاج پیدا ہوا وہ غیر سائنسی تھا بلکہ ضد سائنس (anti-science) تھا۔ سائنس انسان کو خارجی مظاہر قدرت کی طرف مائل کرتی ہے۔ ہم نے ساری توانائیاں باطن کی طرف موڑ دیں اور باطن کا سفر کہیں ختم نہ کیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ سفر طے کر کے باہر کی طرف رخ کر لیتے اور تسخیر ذات کے بعد تسخیر کائنات میں لگ جاتے۔

جس زمانے میں ہمارے ہاں بڑے صوفی پیدا ہوئے۔ یورپ میں اعلیٰ پائے کے سائنسدان

---

[1]۔ The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam by Muhammad Iqbal, p. 150 - 151 (This spirit of total other-worldliness in later Sufism obscured men's vision of a very important aspect of Islam as a social polity, and, offering the prospect of unrestrained thought on its speculative side, it attracted and finally absorbed the best minds in Islam. The Muslim state was thus left generally in the hands of the intellectual mediocre, and the unthinking masses of Islam, having no personalities of a higher calibre to guide them, found their security only in blindly following the schools)

پیدا ہوئے۔

حضرت جلال الدین رومیؒ	(d. 1273)	راجر بیکن	(d. 1294)
حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندیؒ	(d. 1389)	گٹن برگ	(d. 1468)
حضرت شیخ احمد سرہندیؒ	(d. 1624)	کیپلر	(d. 1630)
حضرت باقی باللہؒ	(d. 1605)	ڈیکارٹ	(d. 1650)
حضرت مظہر جان جاناںؒ	(d. 1781)	نیوٹن	(d. 1727)
حضرت سید احمد شہیدؒ	(d. 1831)	جیمز واٹ	(d. 1819)
حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ	(d. 1899)	ڈارون	(d. 1882)
حضرت اشرف علی تھانویؒ	(d. 1943)	آئن سٹائن	(d. 1955)

ہمارے یہ صوفیا کرامؒ عظیم لوگ تھے۔ انہوں نے انسان کی اخلاقی ترقی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔لیکن اچھا ہوتا کہ ان کے ساتھ ساتھ عظیم پائے کہ سائنسدان بھی پیدا ہوتے جو انسانی علم کو آگے بڑھاتے۔ انسان کی روحانی ترقی کے ساتھ ساتھ مادی فلاح کا بھی مداوا کرتے۔

یونان کی اشراقیت (Plotinus) اور ہندو رہبانیت (asceticism) کے زیر اثر تصوف نے ایک فکروعمل کا گورکھ دھندا بنا لیا جو بہت حد تک اسلام کی سادہ روحانی تعلیمات سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ دین و دنیا اور روح و مادہ کے اس حسین توازن کے خلاف تھا جو اسلام کا مقصود تھا۔

میری رائے میں ان غلط تعلیمات کے دو بہت بڑے نقصان ہوئے۔ ایک تو اسلام متحرک وعملی دین کی بجائے چلّہ کشی ومردم بیزاری کی طرف چلا گیا۔ دین کی سماجی، سیاسی ومعاشی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ خدا کی ذات کی بجائے شیخ کی طرف بلایا جانے لگا۔ دین کی عطا کردہ اجتماعیت (collectivity) کی بجائے ذاتی عرفان (gnosis)، کشف (revelation) اور مراقبہ (meditation) جیسے انفرادی اعمال کیے جانے لگے۔ دین نے تمع عبادت ودعا کو بھی اجتماعی عمل بنایا تھا۔ ہم نے اس کو حجرہ تک بلکہ جنگلوں تک محدود کر دیا۔ اس سے سماج ٹوٹنے لگا۔ اجتماعیت کمزور پڑ گئی۔ روحانیت ذاتی فعل بن گیا۔ اس کی اجتماعیت ختم ہوگئی۔ اجتماعیت کی قوت نہ ہونے کی وجہ سے روحانی ونفسی مسائل بڑھنے لگے۔ عبادت کا مقصد اس وقت صحیح طور پر پورا ہوتا ہے جب اس کو اجتماعی طور پر کیا جائے۔ اس لیے اسلام نے نماز باجماعت، جمعہ کی نماز، عیدین اور سالانہ حج پر زور دیا ہے۔

حضرت اقبالؒ نے صحیح کہا ہے کہ عبادت اجتماعی شکل میں زیادہ بہتر نتائج دیتی ہے۔ اصل عبادت ایک سماجی عمل ہے۔ اسلام انفرادی نماز کی بجائے نماز باجماعت اور سالانہ حج پر اس لیے زور دیتا ہے کہ عبادت ایک عالمگیر عمل بنتا جائے۔

> *The real object of prayer, however, is better achieved when the act of prayer becomes congregational. The spirit of all true prayer is social.*
> *With Islam, however, this socialization of spiritual illumination through associative prayer is a special point*

of interest. As we pass from the daily congregational prayer to the annual ceremony round the central mosque of Mecca, you can easily see how the Islamic institution of worship gradually enlarges the sphere of human association[۱].

انفرادی سطح پر عجیب وغریب نفسیاتی مسائل سامنے آنے لگے۔ مست ملنگ، ننگ دھڑنگ ولایت کا دعویٰ کرنے لگے۔ لوگ انہیں غیر معمولی قوتوں کا حامل سمجھنے لگے۔ جذب و کیف (spiritual intoxication) میں صوفی لوگ عجیب وغریب ارشادات فرمانے لگے۔ زندگی کے عملی حقائق سے کٹ کر ذاتی عمودی (vertical) ترقی کے غلط تصور میں پڑ گئے۔ حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کا قول قابل توجہ ہے کہ

محمد عربی برفلک الافلاک رفت و باز آمد
واللہ گرمن رفتمے، ہرگز باز نیامدے

(حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معراج میں آسمانوں پر گئے اور واپس آ گئے۔ خدا کی قسم اگر میں وہاں جاتا تو ہرگز واپس نہ آتا)

حضرت اقبالؒ کے بقول یہی فرق ہے صوفی کے شعور میں اور نبی علیہ السلام کے شعور میں۔ صوفی روحانی تجربے (unitary experiance) کے بعد پھر عام حالت میں واپس نہیں آنا چاہتا مگر نبی علیہ السلام واپس آتا ہے اور انسانیت کے لیے فلاح لاتا ہے۔ وہ اس تجربے سے واپس آ کر تاریخ کی قوتوں

۱۔ The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam by Dr. Iqbal, p.72

کو اپنے قابو میں کرتے ہیں اور فکر و نظر کی ایک نئی دنیا تخلیق کرتے ہیں۔ صوفی کے لیے روحانی تجربہ اس کی معراج ہے۔ انتہا ہے جبکہ نبی علیہ السلام کے لیے روحانی تجربہ صرف سیکھنے کا ایک عمل ہے۔ بیداری کا عمل ہے:

Muhammad of Arabia ascended the highest Heaven and returned. I swear by God that if I had reached that point, I should never have returned. These are the words of a great muslim saint, Abd al-Quddus of Gangoh. In the whole range of sufi literature it will be probably difficult to find words which, in a single sentence, disclose such an acute perception of the psychological difference between the prophetic and the mybtic types of consciousness. The mystic does not wich to return from the repose of unitary experience; and even when he does return, as he must, his return does not mean much for manking at large. The Prophet's return is creative. He returns to forces of history and thereby to create a fresh world of ideals. For the mystic the repose of unitary experience is something final; for the Prophet it is the awakening, within him, of world-shaking psychological forces, calculated to completely transform the human world. The desire to see his religious experience transformed into a living world-force is supreme in the Prophet[1].

---

[1]- The Spirit of Muslim Culture; The Reconstruction of Religios Thoughts in Islam by Dr.Iqbal

(حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلند ترین آسمان پر تشریف لے گئے اور واپس پلٹ آئے۔ خدا کی قسم اگر میں وہاں جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔ یہ الفاظ عظیم صوفی بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے ہیں۔ غالباً پورے صوفیانہ ادب میں پیغمبرانہ ادراک اور صوفیانہ شعور میں موجود واضح نفسیاتی فرق کو ایک جملے میں ادا کرنے کی کوئی اور نظیر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گی۔ صوفی نہیں چاہتا کہ وہ اس واردات اتحاد کی لذت اور سکون سے واپس لوٹے اور جب وہ کبھی لوٹتا ہے اور اسے واپس لوٹنا پڑتا ہے۔ اس کی واپسی نوع انسانی کے لیے کوئی بڑا مفہوم نہیں رکھتی۔ نبی علیہ السلام کی واپسی تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ اس سے لوٹتا ہے تا کہ زماں کی قلمرو میں داخل ہو اور تاریخ کی قوتوں کو قابو میں رکھتے ہوئے مقاصد کی تازہ دنیا تخلیق کرے۔ صوفی کے لیے اتحاد لذت اس کی آخری منزل ہے مگر نبی علیہ السلام کے لیے یہ تجربہ اپنے آپ میں دنیا کو ہلا دینے والی نفسیاتی قوتوں کو بیدار کرنے کا عمل ہے۔ جس سے عالم انسانیت کو مکمل طور پر تبدیل کیا جا سکے۔ یہ خواہش کہ اس کا مذہبی تجربہ ایک زندہ عالمگیر قوت میں تبدیل ہو جائے، نبی علیہ السلام میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے)

ہمارے ہاں صوفیا عام طور پر روحانی تجربے میں مصروف ہو گئے۔ بہت کم لوگوں نے نبوت کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس دنیا میں واپس آ کر تخلیق و تعمیر کی۔ ان کی عمودی (vertical) ترقی سے انسانیت کو عمومی طور پر فائدہ نہ ہوا۔ وہ اپنی عمودی ترقی کو افقی اثر (horizental effect) نہ دے سکے۔ اس لئے انسانی صلاحیتوں کا تاریک غار (black hole) بن گئے۔

معتزلہ[1] (rationalist) کی غیر ضروری عقلیت کے جواب میں ہم نے صوفیت کے وجدان (intution) کو لا کھڑا کیا جس سے ایک غیر عقلی اور توہماتی (superstition) رویے نے جنم لیا۔

عقل علم کا واحد ذریعہ نہ تھا لیکن وحی کے ساتھ ساتھ عقل لازم ہے۔ وحی بھی عقل کو خطاب کرتی ہے۔ ہم نے عقلیت کے خلاف روحانی تجربے کو لا کھڑا کیا۔ کشف، الہام اور وجدان کو علم کا اصل ذریعہ سمجھ لیا۔ عقل اور علم کے خلاف باتیں کرنے لگے۔ صوفیا نے جو بات ایک خاص انداز میں ایک خاص وجہ سے کہی وہ ہم نے عمومی اصول بنا لیا۔ حضرت فرید الدین عطارؒ نے فرمایا ہے کہ

صد ورق و صد کتاب را در نار کن
روئے دل را جانب دلدار کن

(سینکڑوں صفحے اور سینکڑوں کتابیں آگ میں ڈال دیں اور اپنے دل کا رخ اپنے محبوب کی طرف کر لیں)

اس طرح کی عارفانہ گفتگو سے ہم نے غلط نتیجہ نکالا۔ ہم نے ایک غیر عقلی (anti intellectual) رویہ اپنا لیا۔ علم سے دور رہنے لگے جس کے نتیجے میں تصوف نے ایک غیر علمی اور غیر عقلی شکل اختیار کر لی جس کے سبب کم علم صوفیا غیر اسلامی نظریات کا شکار ہو گئے۔ وہ جاہلیت کے حملوں کو نہ سمجھ

---

[1] ۔ معتزلہ ایک عقلیت پسند مسلک ہے جس کا بانی ایک ایرانی نژاد واصل بن عطا تھا جو خواجہ حسن بصریؒ کا شاگرد تھا۔ معتزلہ دین کے سارے معاملات کو عقل کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں عقلی کو نقل پر غیر معمولی فوقیت دیتے ہیں۔ خلافت عباسیہ خاص طور پر مامون الرشید کے دور میں اس مسلک نے بہت زیادہ ترقی کی البتہ بعد میں حکمرانوں کے عتاب کا شکار ہو گیا۔

سکے۔ رام اور رحیم کو، کرما اور کریم[1] کو ایک سمجھنے لگے۔

اس صوفیانہ سوچ سے ایک بہت بڑا نقصان ذات کی نفی (negation of self) کی صورت میں سامنے آیا جس سے شخصی آزادی اور ارتقاء رک گیا۔ صوفی نے اپنی ذات کو شیخ میں فنا (فنا فی الشیخ) کرنا تھا۔ پھر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات میں فنا (فنا فی الرسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اور پھر خدا کی ذات میں فنا (فنا فی اللہ) کرنا تھا۔ اس نفسیاتی سوچ نے وحدت الوجود (Pantheism) کو جنم دیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی ذات کا حصہ بن جائیں گے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فنا کی اس سوچ کے مضمرات کو سمجھا۔ اس فنا کے بعد بقا کو اپنایا۔ خدا کی ذات میں اپنی ذات کو گم کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ خدا کے رحم و کرم پر ہوتے ہوئے اپنی ذات کا تشخص (identity) قائم رکھا۔ ذات کا یہ قیام (affirmation) انسانی ترقی کا بنیادی لازمہ ہیں۔ جب تک انسان اپنی ذات کو آگے نہیں لائے گا، وہ کوئی بھی تخلیقی عمل نہیں کرسکتا۔ یہی ہمارے ساتھ ہوا۔ بڑے بڑے ذہن تصوف کی اس غلط تعبیر کی نذر ہو گئے۔ حیوانی صفات (animal instincts) کو ضبط کرنے کی بجائے ان کو فنا کرنے پر تل گئے۔ غیر ضروری عاجزی نے اعتماد ذات ہی ختم کر دیا۔ خودی میں ڈوب کر باہر نہ نکل سکے۔ حضرت اقبالؒ نے صحیح ارشاد فرمایا ہے کہ

یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں[2]

۱۔ اس ضمن میں ہندوستان میں بارہویں صدی کی ابتدا میں بھگتی تحریک شروع کی گئی جس کا مقصد ہندوستان میں موجود تمام مذہبی خیالات کو ملا کر ایک نیا مذہبی تصور قائم کرنا تھا۔

۲۔ تصوف؛ ضرب کلیم از محمد اقبالؒ

ہم اپنی ذات میں اعتماد کی بجائے فنافی مرشد میں (فنافی الشیخ) کے چکر میں پڑ گئے۔قرآن مجید نے آسمان وزمین کی طرف بلایا تھا ہم نے کہا کہ شیخ کی اطاعت کرو۔ بقول حافظ شیرازیؒ:

بے سجّادہ رنگین کُن گرَت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبوَد ز راہ و رسمِ منزلہا[1]

(اگر پیر صاحب کہیں تو پیالہ شراب سے بھرلو، اس لیے کہ شیخ صاحب کو منزل کے راستوں کا عرفان حاصل ہوتا ہے)

اس نظام فکر سے غیر صحتمندانہ شخصی تقدس اور شخصیت پرستی (personality cultism) نے جنم لیا جو بذات خود تحقیق وتعلیم کی دشمنی ہے۔ یہ سوچ جب آگے بڑھی تو اس نے نعرہ لگایا کہ ولایت نبوت سے بہتر ہے۔ ولی (پیر) نبی سے زیادہ اہمیت اختیار کر دیا جوسراسر غیر اسلامی سوچ تھی۔

تقویٰ کے نام پر ہم نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ جائز نعمتیں بھی اپنے اوپر حرام کرلیں۔حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار ایک معمولی وجہ سے ارادہ فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئندہ شہد نہیں کھائیں گے۔اس ارادہ پر اللہ پاک نے ناراضگی کا اظہار فرمایا[2]۔ہم نے اب بہت سی نعمتیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی کے نام پر اپنے لیے ترک کرلی ہیں۔

میرے ایک پیارے دوست نے ایک بار مجھے پورے اعتماد میں لے کر بتایا کہ ان کے پیر صاحب بہت عبادت گزار تھے۔انہوں نے ایک ٹہنی پکڑ کر کئی سال ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر عبادت کی۔

ا۔غزل اول: بیت چہارم۔دیوان حافظؒ از حافظ محمد شیرازیؒ

۲۔سورۃ التحریم: آیت: 1 (يَآيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ :اے نبی! جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے حلال کر دیا ہے اسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیوں حرام کرتے ہیں؟)

مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں نے عرض کیا کہ یہ حضور نبی کریم ﷺ کی سنت نہیں ہے۔ آپ ﷺ آرام بھی فرماتے تھے۔ کام بھی کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے ساری رات عبادت سے منع فرمایا ہے۔ سارا سال روزے رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ آقائے نامدار ﷺ نے تو ہمیں اعتدال کا سبق دیا ہے۔ حدیث مبارکہ ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: دین بہت آسان ہے۔ پس تم لوگ میانہ روی اختیار کرو اور (اعتدال سے) قریب رہو اور خوش ہو جاؤ (کہ تمہیں ایسا دین ملا) اور صبح اور دوپہر کے بعد اور کچھ رات میں عبادت کرنے سے دینی قوت حاصل کرو[1]۔

اس عبادت گزاری سے مجھے یاد آیا کہ سینٹ میکیر لیس چھ ماہ تک ایک دلدل میں رہتا رہا اور عام طور پر ایک من لوہے کا وزن اپنے گلے میں رکھتا تھا۔ ہمارے بھی ملنگ یہی کرتے ہیں۔ زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں۔ سینٹ یوسیس تین سال تک ایک خشک کنویں میں مقیم رہا۔ مشہور راہب یوحنا مسلسل تین سال تک کھڑے ہو کر عبادت کرتا رہا۔ سونے کے لیے بس ایک چٹان پر لیٹ جاتا تھا۔ سینٹ انتھونی نے کبھی پیر دھونے کا گناہ نہیں کیا تھا۔ سینٹ ابراہم نے پچاس سال میں کبھی اپنا منہ نہیں دھویا۔ سبحان اللہ کیا تقویٰ تھا؟ یہ روایت اسلام میں ممکن نہیں ہے[2]۔

ہمیں اس تصوف کو غیر اسلامی اور غیر انسانی نظریات سے پاک کرنا ہوگا۔ روحانیت اللہ پاک کی ذات عالی کی حضوری اور حضور نبی کریم ﷺ کی غلامی کا نام ہے۔ ہمیں نبوی مزاج اپنانا ہوگا۔ انسانوں میں رہتے ہوئے اعلیٰ اخلاق اور روحانی واردات رکھتے ہوئے عمومی فلاح کے لئے کام

---

[1]۔ صحیح بخاری۔ جلد اول: رقم: 38

[2]۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر از سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ صفحہ نمبر 212 بحوالہ تاریخ اخلاق یورپ از لیکی

کرنا ہوگا۔ روحانی تجربے اور نفسیاتی بیماریوں میں فرق کرنا ہوگا۔ انسانیت سے محبت کرنا ہوگی۔ عاجزی پیدا کرنا ہوگی۔ دین کی اشاعت کے لئے اپنے آپ کو گھولنا ہوگا۔ اجتماعیت میں انفرادیت ڈھونڈنا ہوگی۔ نیلے پیلے رنگوں اور نفسیات خوابوں سے نجات پانا ہوگی۔ طریقت کو شریعت کے تابع کرنا ہوگا۔

یہ حکمتِ ملکوتی، یہ علمِ لاہُوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں[1]

11۔ جہاد کا صحیح تصور

عہد حاضر کے سیاسی تناظر میں جہاد سے کیا مراد ہے؟ کن کن حالات میں ہمارے نوجوان بندوق اٹھا سکتے ہیں؟ کیا اس کی کوئی شرائط بھی ہیں؟ کیا جہاد صرف اسلحہ سے ہوتا ہے؟ کن حالات میں اسلحہ سے جہاد مناسب نہیں ہے؟ کیا مسلمانوں کے ایک فرقے کا دوسرے فرقے سے برسر پیکار ہونا بھی جہاد ہے؟ کن حالات میں جہاد فرض عین (سب مسلمانوں پر فرض) ہے؟ کب یہ صرف فرض کفایہ (چند لوگوں پر یا مقامی لوگوں پر فرض) ہے؟ ہمارا بہت خون بہہ چکا ہے۔ جوانیاں لٹ گئی ہیں۔ اب اس پر غور کی ضرورت ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ جو انقلاب لائے۔ اس میں 23 سال لگے۔ کم و بیش 81 چھوٹے بڑے معرکے ہوئے۔ 27 معرکوں میں آپ ﷺ خود شریک ہوئے۔ ان 23 سالوں میں 259 مسلمان شہید ہوئے اور 759 غیر مسلم قتل ہوئے۔ یعنی کہ کل 1018 قتل ہوئے۔ یہ تاریخ کا عظیم

۱۔ تصوف؛ ضرب کلیم از محمد اقبالؒ

ترین انقلاب تھا۔ خون اتنا کم بہا ہے کہ اسے غیر خونی انقلاب (bloodless revolution) کہا جاسکتا ہے [1]۔

آیئے ہم عہد حاضر کی اسلامی تحریکوں کو دیکھیں۔ الجزائر کے جہاد میں 25 لاکھ مسلمان مارے گئے۔ ہندوستان و پاکستان وکشمیر و افغانستان اور چیچنیا میں لاکھوں لوگ قتل ہو گئے۔ یہی حال فلسطین، شام اور مصر میں ہے۔ میری اس بات کا یہ مطلب بالکل نہیں ہے کہ میں جہاد کے تصور کے خلاف ہوں۔ میں اتنی گزارش کررہا ہوں کہ ہمیں جہاد کا مفہوم متعین کرنا چاہیے۔ اس کی اقسام اور حکمت عملی متعین کرنی چاہیے۔ وگرنہ خون بہتا رہے گا اور کوئی قابل قدر فائدہ بھی نہ ہوگا۔ فیض احمد فیض (d. 1980) نے غالباً ہمارے لیے کہا ہے:

نہ مدعی نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہوا [2]

جہاد کی کئی قسمیں ہیں: علمی جہاد، دعوتی جہاد اور قتال وغیرہ۔ سورۃ الحج میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ [3]

(اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے)

اس آیت کی تفسیر میں مولانا مودودیؒ (d. 1979) نے لکھا ہے کہ جہاد سے مراد محض قتال (جنگ)

۱۔ Muhamamd: A Prohhet for all Humanity by Wahidduddin Khan, p. 132

۲۔ لہو کا سراغ: نسخہ ہائے وفا از فیض احمد فیض

۳۔ سورۃ الحج: آیت: 78

نہیں ہے بلکہ یہ لفظ جدوجہد اور کشمکش اور انتہائی سعی و کوشش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے[1]۔ مولانا ثناءاللہ پانی پتیؒ کی رائے میں جہاد سے مراد جدوجہد اور سعت و طاقت ہے۔[2]

سورۃ الفرقان میں ارشاد ہے:

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا[3]

(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ جہاد کبیر کرو)

جہاد کبیر کے تین معنی ہیں:

(i) انتہائی کوشش جس میں آدمی سع و جان فشانی کا کوئی وقیقہ اٹھا نہ رکھے۔

(ii) بڑے پیمانے پر جدوجہد جس میں آدمی اپنے تمام ذرائع لا کر ڈال دے۔

(iii) جامع جدوجہد جس میں آدمی کوشش کو کوئی پہلو اور مقابلے کا کوئی محاذ نہ چھوڑے[4]۔ جہاد عظیم سے مراد دل سے، زبان سے اور تلوار سے جہاد ہے[5]۔

---

[1] تفہیم القران از مولانا مودودیؒ بحوالہ سورۃ الحج: آیت: 78

[2] تفسیر مظہری از مولانا ثناءاللہ پانی پتیؒ بحوالہ مذکورہ

[3] سورۃ الفرقان: آیت: 52

[4] تفہیم القرآن از مولانا مودودیؒ بحوالہ مذکورہ

[5] تفسیر مظہری از مولانا ثناءاللہ پانی پتی؛ تفسیر ضیاء القرآن از پیر کرم شاہ از ہریؒ بحوالہ مذکورہ

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے (ذہن میں رہے کہ یہ وہ جنگ واحد ہے جس کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی الاعلان تیاری کروائی اور اس جنگ میں اسلامی مملکت کے وجود کو شدید خطرہ تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین شاندار قربانی کر کے اپنی پکی فصلیں چھوڑ کر اس غزوہ میں گئے تھے)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر

(ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہے ہیں)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے زمانہ امن کی دعوتی سرگرمیوں کو یہاں جہاد اکبر کہا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجاہدین کی ایک جماعت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آ گئے بہت ہی خوب آئے۔ تم لوگ جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف آ گئے ہو۔ جس میں بندے کو نفس سے جہاد کرنا پڑتا ہے[1]۔

جہاد کی ایک شکل قتال (جنگ) ہے جو بعض اوقات سب سے افضل قسم بھی بن جاتی ہے۔ 1979ء میں سوویت یونین (USSR) نے افغانستان پر قبضہ کر لیا اور اشتراکی لادینی نظام ٹینکوں کے زور سے نافذ کرنے کی کوشش کی تو مسلمانوں کا اجماع تھا کہ یہ جہاد ہے۔ یہ جہاد کی ایک شکل تھی۔ جہاد صرف اسی کا نام نہیں ہے۔

جہاد کا ایک تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان اسلام سے بخوبی واقف ہو جس کی خاطر وہ جہاد کر رہا ہے۔

۱۔ کنز العمال۔ جلد دوم: رقم: 6673

کفر و جاہلیت کو جانتا ہو جس کے خلاف وہ جہاد کر رہا ہے تا کہ کفر جس رنگ میں بھی ظاہر ہو اس کی معرفت ہو سکے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

مجھے خطرہ ہے کہ وہ شخص اسلام کی کڑیاں بکھیر دے گا جس نے اسلام میں نشوونما پائی مگر وہ جاہلیت کو نہیں پہچانتا[1]۔

لگتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آج کل کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے۔ ہم نے جہاد کو بدنام کر دیا ہے۔ اس کو بے ہودہ (vulgarize) کر دیا ہے۔ اہل اقتدار کبھی اپنے مفاد میں اور کبھی آقاؤں کے اشاروں پر جہاد کرتے ہیں۔ کبھی پھر اپنے مفاد میں اور کسی کے اور کے اشارے پر اس کو دہشت گردی سمجھتے ہیں۔ یہ مذاق اب بند ہونا چاہیے۔ اہل اقتدار کو تو ڈالر ملتے ہیں۔ خون تو مخلص نوجوانوں کا ہوتا ہے۔ ان کی مائیں رو رو کر آنسو خشک کر لیتی ہیں۔ نوجوان دلہنوں کے سہاگ لٹ جاتے ہیں اور ہمارا کھیل ہو جاتا ہے۔ مجھے انگریزی شاعر شیکسپیر (William Shakespeare, d. 1616) کا ایک مصرع یاد آ رہا ہے:

As flies to the wanton boys: We are to the gods
They kill us for their sports.

12۔ اجتہاد کی ضرورت

انسانی زندگی میں ثبات (constancy) و تغیر (change) لازم ہے۔ کچھ ایسے اصول چاہیں جو

---

[1]۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر از سید ابوالحسن علی ندوی۔ صفحہ نمبر 162

مستحکم ہوں۔ پائیدار ہوں۔ جن پر تبدیلی کا عمل نہ ہو سکے۔ قرآن پاک کی اصطلاح میں انہیں محکمات کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر توحید، رسالت، آخرت اور شرف انسانی وغیرہ۔ ان محکمات کے ساتھ تہذیب انسانی کو کچھ تغیرات چاہیے ہوتے ہیں تا کہ ہر زمانہ میں زندہ رہا جا سکے۔ تہذیب انسانی کی سماجی و معاشی اور علمی ترقی کا ساتھ دینے کے لیے اسلام نے اجتہاد کا تصور دیا ہے۔

اجتہاد سے مراد نیا دین نہیں ہے بلکہ دین کے ابدی اصولوں کی عہدی تعبیر (cotemporal interpertation) ہے۔ اجتہاد ایک محض فنی مسئلہ نہیں ہے بلکہ انسانی ضرورت ہے۔ حالات کا تقاضا ہے۔ مثال کے طور پر پہلے تجارت کشتیوں پر ہوتی تھی۔ اب بحری جہازوں، ہوائی جہازوں، بنکوں اور انٹرنیٹ کے ذریعے ہوتی ہے۔ تجارت کے بنیادی اصول (سچائی، دیانت داری، جائز منافع، عدم استحصال، ملکیت کی حفاظت، اخلاق کی حفاظت اور وعدہ کی پابندی وغیرہ) تو وہی رہیں گے لیکن ان جدید ذرائع تجارت میں نئی تعبیر (interpretation) اور پرانے اصولوں کی تطبیق (re-application) ہو گی۔ اس لیے کہ انسان کشتی کے دور کی تجارت سے نکل کر ای کامرس (e-commerce) میں داخل ہو چکا ہے۔

علامہ شاطبیؒ[1] (d. 1388) نے تحریر کیا ہے کہ اجتہاد کی ضرورت قیامت تک رہے گی۔ اس کی

---

[1]۔ ابواسحاق ابراہیم بن موسیٰ بن محمد اللخمی الشاطبیؒ (1320ء–1388ء) ایک مشہور محدث، فقیہ، لغوی اور جامع العلوم تھے جنہیں مجدد دین اسلام میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ مالکی المسلک تھے۔ آپؒ کی تفسیر شاطبیؒ کا شمار جدید دور کی قرآن پاک کی شاہکار تفاسیر میں ہوتا ہے۔

دلیل یہ ہے کہ انسان نے آخر دم تک شریعت پر عمل کرنا ہے۔ جبکہ شریعت صرف بنیادی اصول فراہم کرتی ہے اور زندگی کی تفصیلات زمانے کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے شریعت کے بنیادی اصولوں کی نئے حالات میں تشریح و تطبیق کے لیے اجتہاد کرنا پڑے گا[1]۔

اجتہاد کے لفظ کا ماخذ جہد ہے۔ جس کا مطلب کوشش کرنا ہے۔ اجتہاد کا مطلب زیادہ کوشش کرنا ہے۔ پوری صلاحیت استعمال کرنا ہے۔ مذہبی اصطلاح میں اس کا مفہوم ہے کہ اپنی پوری کوشش کر کے کسی نئے معاملے میں دین کے اصولوں کی روشنی میں اپنی رائے بنانا۔

اجتہاد کی دو قسمیں ہیں: جزوی (partial) اجتہاد اور کلی (total) اجتہاد۔

جزوی اجتہاد سے مراد ہے کہ کسی ایک فروعی حکم میں دین کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اپنی رائے بنانا۔ اس کی ایک مثال غزوہ خندق میں پیش آئی۔ جنگ خندق سے فارغ ہو کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک گروہ کو حکم دیا کہ وہ بنی قریظہ کی بستی میں جائیں اور وہاں جا کر عصر کی نماز پڑھیں۔ وہ لوگ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں عصر کی نماز کا وقت آ گیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وہ جماعت دو حصوں میں بٹ گئی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم راستے میں نماز نہیں پڑھیں گے بلکہ منزل پر پہنچ کر پڑھیں گے۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ یہ تھے کہ بنی قریظہ میں جا کر نماز پڑھیں۔ اس کے برعکس کچھ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ نماز میں تاخیر ہو رہی ہے۔ راستے میں نماز پڑھ لی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو حکم دیا تھا اس کا اصل مطلب یہ تھا کہ جلد از جلد منزل پر

---

[1]۔ الموافقات فی اصول الشریعہ از امام شاطبیؒ۔ جلد چہارم

پہنچا جائے۔ تاخیر نہ کی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں گروہوں کی رائے کو منظور فرمایا[1]۔

کلی اجتہاد سے مراد ہے کہ کسی صورت حال میں عام فکر سے اوپر اٹھ کر دین کے وسیع تر مفاد میں رائے قائم کی جائے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں صلح حدیبیہ اس کی عمدہ مثال ہے (نبی علیہ السلام وحی کی روشنی میں کام کرتے ہیں۔ نبی کا عمل سنت کہلاتا ہے جو اجتہاد کا ماخذ ہے۔ اس لیے یہاں سیرت پاک کی مثالوں کو وسیع تر تناظر میں دیکھنا چاہیے)۔ یہ معاہدہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یک طرفہ شرائط پر کیا۔ عمرہ چھوڑ دیا۔ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا لفظ مٹا دیا۔ حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ جیسے زخمی مظلوم کو واپس بھیج دیا۔ سب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ناخوش تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گلہ کیا کہ ایسی شرائط پر تو معاہدے ہم نے دور جاہلیت اور کمزوری کے وقت بھی نہیں کیے تھے۔ اب تو ہمارے پاس ہدایت اور قوت ہے۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وقتی مصلحتوں اور پریشانیوں سے اوپر اٹھ کر سوچا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر حال کی بجائے مستقبل کو دیکھ رہی تھی۔ نتیجہ دیکھ لیں۔ قرآن مجید نے اس کو فتح مبین کہا ہے۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ بظاہر دب کر کی جانے والی صلح اصل میں اسلام کے لیے مفید ثابت ہوئی اور غلبہ اسلام کا سبب بنی۔

عام طور پر کسی بھی دینی حکم سے کلی اور جزوی اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ جب کفار مکہ کے ظلم سے تنگ آ کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے لگے تو قریش کے کچھ لڑکوں نے ان کا راستہ روکا اور دینار چھین لیے۔ اب حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کے سامنے یقیناً یہ حدیث ہو گی کہ جو شخص اپنی جائیداد کو بچاتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے[2]۔ ان کے سامنے

---

[1]۔ صحیح بخاری۔ جلد دوم: رقم: 1342

[2]۔ دیکھیے صحیح بخاری۔ جلد اول: رقم: 2380

شہادت کے فضائل بھی ہوں گے۔آپ رضی اللہ عنہ باہمت انسان بھی تھے۔لیکن انہوں نے قریش کے ان لڑکوں سے لڑنا پسند نہ کیا۔شہادت کو چھوڑ دیا بلکہ اسلام کے وسیع تر مفاد میں اپنے دینار لڑکوں کے حوالے کر دیئے[1]۔اپنی جان بچا کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔یہ کلی اجتہاد کی ایک شکل تھی۔

ہمیں عہد حاضر میں ایک عمومی اور کلی اجتہاد کی ضرورت ہے۔جس کے نتیجے میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی ضرورت ہے۔حضرت اقبالؒ نے 1929ء میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید (The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam) میں اس عظیم کام کو شروع کیا۔عہد حاضر شدید تقاضا کرتا ہے کہ اس تشکیل جدید کے عمل کو جلد از جلد آگے بڑھایا جائے۔تشکیل جدید کلی اجتہاد سے ہوتی ہے۔جس کے لیے ہمارے علما تیار نہیں ہیں۔اس لیے تشکیل جدید کا عمل نہیں ہو سکا حالانکہ اجتہاد اسلام میں مطلوب ہے۔لازم ہے۔اجتہاد اتنا مطلوب ہے کہ اجتہادی غلطی پر بھی ثواب ملتا ہے۔حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب کوئی آدمی فیصلہ کرے اور وہ اجتہاد کرے اور اس کا فیصلہ درست ہو تو اس کے لیے دو اجر ہیں۔اگر وہ فیصلہ کرے اور اجتہاد کرے پھر وہ غلطی کر جائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے[2]۔

علماء نے لکھا ہے کہ پہلے شخص کے لیے جو دو اجر،کوشش اور درستگی کے لیے ہیں جبکہ دوسرے شخص کو

۱۔کنز العمال۔جلد اول:رقم:4271

۲۔صحیح بخاری۔جلد سوم:رقم:2252

صرف کوشش کا اجر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اجتہاد اتنا پسندیدہ عمل ہے کہ اس میں غلطی کرنے پر بھی ثواب ہے۔ بشرطیکہ انسان کی نیت درست ہو۔ اس سے اصول طے ہو گیا کہ اجتہاد ہر حال میں جاری رہنا چاہیے۔ چاہے غلطیاں بھی ہوتی رہیں۔ اب ہم نے اجتہاد ختم کر دیا ہے کہ کہیں غلطی نہ ہو جائے۔ یہ اسلام کی تعلیم اور وقت کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ اس لیے ہم پر جمود (inertia) طاری ہے۔ ذلت مقدر ہے۔

اجتہاد ایک لازم مگر نازک مسئلہ ہے۔ ہر آدمی اس کا اہل نہیں ہو سکتا۔ صاحب اجتہاد کے لیے شرائط کا ہونا لازم ہے۔ اس لیے اسلام میں اس کی کئی شرائط ہیں۔ مثلاً

(i) عربی زبان کا عالم ہونا۔

(ii) قرآن کا عالم ہونا۔

(iii) حدیث کا عالم ہونا۔

(iv) اصول تفسیر، اصول حدیث اور اصول فقہ سے واقف ہونا۔

(v) عظیم فقہا کی آراء سے واقف ہونا۔

(vi) دین کی روح سے واقف ہونا، شریعت کے مقاصد سے واقف ہونا۔

(vii) احکام دین پر عمل کرنا وغیرہ وغیرہ۔

ان معیارات کو اگر ہم دیکھیں تو ہمیں اپنے اردگرد بہت سے علما نظر آئیں گے جو ان شرائط پر پورا اترتے ہیں لیکن پھر بھی اجتہاد کا عمل جاری نہیں ہے۔ اس کا ایک سبب شخصیت پرستی (personality cult) ہے۔ ہم علمی تنقید و جرح کو برا سمجھتے ہیں حالانکہ اول اسلام ایسا نہ تھا۔ اول فقہ میں ایسا نہ تھا۔ حضرت

امام ابوحنیفہؒ (d. 772) کے شاگردوں نے 85% معاملات میں اپنے استاد سے اختلاف کیا اور آج کل فقہ حنفی حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 772) کے شاگردوں کی آراء پر قائم ہے[1]۔

ہمارے نزدیک تنقید یا اختلاف رائے ایک (taboo) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے ولایت (England) میں حیرانی ہوئی کہ جب وہاں ہمیں مقدمات کی نظائر (precedents) پڑھا رہے ہوتے تھے تو عام جونیئر اساتذہ بھی برطانیہ کی اعلیٰ ترین عدالت (House of Lords) کے فیصلوں پر بہت بے رحمی سے تنقید کرتے تھے۔ اس کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ جدید نظام تعلیم میں جرح و تنقید کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ بڑوں کے نظریات پر تنقید بالکل عام ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں میں ناقدانہ فکر (critical thinking) پائی جاتی ہے۔ جس کے سبب مغرب ہر لمحے ترقی کرتا رہتا ہے۔

ضمیر مغرب ہے تاجرانہ، ضمیر مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ[2]

ہم نے اپنے بڑوں کے گرد تقدیس (holiness) کے ہالے بنا لیے ہیں۔ ذرا سا اختلاف بھی ان کی توہین ہے اور گردن زنی ہے حالانکہ اختلاف اور احترام دو مختلف چیزیں ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ صلح حدیبیہ اور جنگ حنین کے موقع پر اکثر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شدید اختلاف کیا تھا؟ خلافت راشدہ کے دور میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ امام ابو یوسفؒ (d. 798) اور امام محمدؒ (d. 805) نے امام ابوحنیفہؒ (d. 772) سے اکثر

۱۔ خطبات بہاولپور از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صفحہ نمبر 92

۲۔ ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض؛ ارمغان حجاز از محمد اقبالؒ

معاملات میں اختلاف کیا ہے۔ آپ دیکھیں کہ احترام ومحبت بھی برقرار رہی اور اختلاف بھی ہوا۔

اس لیے ہمیں یہ رٹ چھوڑ دینی چاہیے کہ فقہ کے چار مسلمہ مکاتب فکر (حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ) کے علاوہ کوئی رائے نہیں ہوسکتی۔ دوسری رائے ہوسکتی ہے۔ قدیم وجدید علما کی ایک کثیر اور قابل احترام جماعت اس کی حامی ہے۔ امام عبدالسلامؒ (d. 1262)، علامہ بحرالعلوم حنفیؒ، امام شوکانیؒ[1] (d. 1839)، اشرف علی تھانویؒ[2] (d. 1943) اور شیخ مصطفیٰ المراغیؒ[3] (d. 1945) اس صف میں شامل ہیں۔

ہمارے ہاں کلی اجتہاد کی ایک بہت اچھی کوشش حضرت شاہ ولی اللہؒ (d. 1762) نے کی۔ شاہ صاحبؒ نے اسلام کی اجتماعی ہیئت اور عدل اجتماعی پر بہت زور دیا۔ جہادی تحریک (1831ء)، علما دیوبند، جامعہ ملیہ، ندوۃ العلماء، جماعت اسلامی، جمعیت العلماء ہند، علامہ شبلی نعمانیؒ[4] (d. 1914)، سرسید احمد خان (d. 1898)، اور اقبالؒ (d. 1938) سب کسی نہ کسی درجہ میں شاہ صاحبؒ سے متاثر ہیں۔

---

[1]۔ امام محمد الشوکانیؒ (1759ء-1839ء) معروف یمنی اسلامی محقق، فقہ اور اصلاح پسند سکالر تھے۔

[2]۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (1863ء-1943ء) ہندوستان کے معروف حنفی سکالر تھے۔

[3]۔ شیخ محمد مصطفیٰ المراغیؒ (1881ء-1945ء) جامعۃ الازہر کے ریکٹر اور مصری اصلاح پسند مفکر تھے۔ آپ نے قرآن و حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے اجتہاد پر زور دیا۔

[4]۔ مولانا شبلی نعمانیؒ (1857ء-1914ء) برصغیر پاک وہند کے معروف اسلامی سکالر اور ندوہ العلماء کے بانی تھے۔ آپ کو جدید اسلامی تحقیقات کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ ان کی سیرت النبی ﷺ، الفاروق، سوانح مولانا روم، علم الکلام، المامون، موازنہ (دبیر و انیس)، شعر العجم، مقالات شبلی، سیرت النعمان اور الغزالی مایہ ناز تصنیفات ہیں۔

نہایت ادب سے کہنا چاہتا ہوں کہ شاہ ولی صاحبؒ (d. 1762) کے لیے مناسب نہ تھا کہ اپنی کتاب فیوض الحرمین میں لکھتے کہ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ قائم الزمان ہیں۔ مسلمانوں کو اس طرح کی نفسی کیفیات سے نکالنے کی ضرورت تھی۔ یہ نفسی و روحانی تجربات ایک فرد کے لیے ٹھیک ہو سکتے ہیں لیکن ان کو امت کے سامنے رکھنا اور ان کی بنیاد پر دین کی تعبیر کرنا یا اس تعبیر کی صداقت پر دلیل لانا مناسب نہیں ہے۔ ہمیں خالصتاً دینی تعلیمات اور عقل کو معیار بنانا ہے۔ خواب و کشف کا اب زمانہ نہیں رہا۔ یہ ہماری ذات کے لیے مناسب ہو سکتا ہے۔ یہ شخصی تجربہ تو ٹھیک ہے لیکن اسے اجتماعی تجربہ بنانا نقصان دہ ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ امام شافعیؒ (d. 820) کے بعد کوئی مجتہد مطلق پیدا نہیں ہو سکتا[1]۔ یعنی کہ اب کلی اجتہاد نہیں ہو سکتا۔ نہایت ادب سے گزارش ہے کہ کہ زمانہ امام شافعیؒ کے رک نہیں گیا بلکہ رواں دواں ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اب یکسر بدل گیا ہے بلکہ اس انٹرنیٹ کے زمانے میں زمانہ ہر دس سال میں بدل رہا ہے۔ ہم امام شافعیؒ سے سو فیصد محبت کرتے ہوئے بھی ان کے زمانے میں نہیں رہ سکتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ نئے اصول بنائے جائیں لیکن اتنا ضرور کہتا ہوں کہ اعلیٰ اصولوں کی نئی تعبیر اور تطبیق (re-application) نہایت لازم ہے۔

شاہ صاحبؒ بھی عہد حاضر کے تمام فتنوں کا دراک نہ کر سکے۔ شاہ صاحبؒ کے زمانے میں عہد حاضر کے نئے مسائل جنم لینے لگے تھے۔ شاہ صاحبؒ ان سے بے خبر رہے۔ شاہ صاحبؒ کے زمانے میں یورپ میں مسلمانوں کے زیر اثر نشاۃ ثانیہ (Renaissance) شروع ہو چکی تھی بلکہ صنعتی انقلاب (industrial revolution) شروع ہو رہا تھا۔ یورپی تاجر، مشنری، سیاح اور

---

[1] ۔ فکر اسلامی از وحید الدین خان۔ صفحہ نمبر 53

سائنسدان اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ انگریزوں نے 1639ء میں مدراس اور 1661ء میں بمبئی پر قبضہ کرلیا تھا۔ ہندوستان کے اکثر ساحلی علاقے یورپ کی نئی سائنس وسماجی طاقت کے سبب انگریزوں کے قبضے میں آ گئے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے تفصیل کے ساتھ جہاد وقتال کے اصول ومسائل بیان کیے ہیں لیکن دعوت وتبلیغ پر زیادہ توجہ نہ دی۔ ان کی کتب دین کے اس اہم پہلو پر زیادہ تر خاموش ہیں۔ مسلمانوں میں حربی (militant) سوچ رہی ہے۔ جبکہ دین زیادہ تر دعوتی سوچ کا نتیجہ ہے اور اسی سے قائم ہے۔ اسی سے قائم رہے گا۔ سید احمد شہیدؒ[1] (d. 1831) کی تحریک سے لے کر اخوان المسلمین[2] اور طالبان تک کی تاریخ گواہ ہے کہ ان تحریکوں کے پاک باز نوجوان بھی اپنی جوانیاں لٹا کر اسلام کو غلبہ نہ دے سکے۔ غالباً اسی لیے کہ اسلام میں تلوار سے زیادہ قلم کی اہمیت ہے۔ دین اقراء سے شروع ہوا ہے۔ سیف (تلوار) سے شروع نہیں ہوا۔ اس لیے نتیجہ صاف ظاہر ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ (d. 1762) سے پہلے گیلیلیو (Galilio, d. 1645) اور نیوٹن (Newton, d. 1727) سائنس میں انقلاب لا چکے تھے۔ شاہ صاحبؒ اس سائنسی فکر سے بے خبر رہے۔

۱۔ سید احمد شہیدؒ (1786ء - 1831ء) برصغیر پاک وہند کے صوفی بزرگ، مجدد اور مرد مجاہد تھے۔ آپؒ نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ سے منازل سلوک طے کیں۔ آپؒ کی کوششوں سے ہندوستان کو سکھوں اور انگریزوں سے آزاد کروانے کے لیے تحریک مجاہدین وجود میں آئی۔ آپؒ نے سکھوں سے کچھ علاقہ فتح کر کے وہاں اسلامی قوانین کا نفاذ بھی کیا۔ بالآخر بالاکوٹ کے مقام پر مقامی لوگوں کی بے وفائی کی وجہ سے سکھ راجہ رنجیت سنگھ کی فوجوں نے آپؒ کو شہید کردیا۔

۲۔ اخوان المسلمین اسلامی تعلیمات کے احیاء کی جماعت ہے جو 1929ء میں مصر میں قائم ہوئی۔ اس کے بانی شیخ حسن البنا تھے۔ اس جماعت کا منشا اسلام کے بنیادی عقائد کا احیا اور ان کا نفاذ تھا۔ مگر بعد میں یہ جماعت سیاسی شکل اختیار کرگئی اور مصر میں یہ تحریک کافی مقبول ہوئی اور اس کی شاخیں دوسرے عرب ممالک میں بھی قائم ہوگئیں۔

حتیٰ کہ شاہ صاحبؒ کی معرکتہ الآراء کتاب حجتہ البالغہ 1870ء میں پہلی بار چھپ سکی جبکہ یورپ میں چار سو سال پہلے کتابیں چھپ رہی تھیں[1]۔

میں شاہ صاحبؒ کا بہت معترف ہوں۔ انہوں نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کر کے ہندوستان میں دین کی تفہیم پیدا کی۔ ان کے مدرسہ رحیمیہ نے دین کی اشاعت میں بہت اہم کردار ادا کیا لیکن میری گزارشات کا مطلب یہ ہے کہ میں اور زیادہ کلی اجتہاد کی ضرورت ہے۔ ہمیں ہر وقت کئی شاہ صاحبان کی ضرورت ہے۔ عہد حاضر میں بھی شاہ صاحبان کی ضرورت ہے۔ مجھے دکھ یہ ہے کہ یہ سلسلہ آگے کیوں نہیں چلا۔ ہمارے ہاں ابن تیمیہؒ (d. 1328) کے بعد شاہ صاحبؒ آئے اور پھر خاموشی رہی جبکہ زمانہ اپنی رفتار اور تیز کر رہا ہے۔

اجتہاد سے مراد یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی قیادت زندگی کے نئے پیش آنے والے مسائل میں انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ اسلام کی روح اور اسلام کے قانون سے اتنی گہری واقفیت رکھتے ہوں کہ وہ امت کی مشکلات کو حل کر سکیں۔ وہ عقل اور علم رکھتے ہوں۔ محنت کے لیے تیار ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس وسیع کائنات میں جو قوتیں عطا کی ہیں۔ ان سے کام لے سکیں۔ ان کو اسلام کے مقاصد کے لیے مفید بنا سکیں[2]۔

بدقسمتی سے ہماری صورت حال بالکل اس کے برعکس ہے۔ ہماری قیادت عام طور پر ایک بدترین اشرافیہ (corrut elite) کے ہاتھوں میں ہے۔ جس کے پاس نہ عقل ہے اور نہ علم، اخلاق ہے اور

---

[1]۔ Ptolemy: بطلیموس (100ء-170ء) ایک مشہور یونانی ماہر فلکیات، جغرافیہ دان اور ریاضی دان تھا۔

[2]۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر از سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ صفحہ نمبر 163

نہ ایمان۔ فقط زر پرستی اور جاہ پرستی ہے۔ اگر اسلام انہیں پسند ہے تو ووٹ لینے کے لیے یا اقتدار کو طول دینے کے لیے۔ ظلم یہ ہے کہ اہل اسلام عام طور پر ایسے لوگوں کی تقویت کا سبب بنتے ہیں۔

سید ابوالحسن علی ندویؒ (d. 1999) ترکوں کی سلطنت کے زوال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

سب سے بڑا مرض جو ترکوں میں پیدا ہوا تھا وہ جمود تھا۔ جمود بھی دونوں طرح کا۔ علم و تعلیم میں بھی جمود اور فنون جنگ و عسکری تنظیم و ترقی میں بھی۔ قران مجید کی یہ آیت انہوں نے بالکل فراموش کر دی: مسلمانو! جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لیے اپنا ساز و سامان مہیا کیے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ تعالیٰ کے اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو[1] اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ان کے حافظہ سے گویا محو ہو گیا تھا کہ دانائی کی بات مومن کا گم شدہ مال ہے۔ جہاں اس کو مل جائے وہی اس کا زیادہ حق دار ہے[2]۔ ایسی حالت میں کہ وہ یورپ کی حریف سلطنتوں اور قوموں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ ان کو فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی وہ وصیت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے تھی جو انہوں نے مصر کے مسلمانوں کو کی تھی کہ اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ تم قیامت تک خطرہ کی حالت میں ہو۔ ایک اہم ناکہ پر کھڑے ہوئے ہو۔ اس کہ تم ہمیشہ ہوشیار اور مسلح رہنا چاہیے۔ کیونکہ تمہارے چاروں طرف دشمن ہیں اور ان کی نگاہیں تم پر اور تمہارے ملک پر لگی ہوئی ہیں۔

---

[1] ۔ سورۃ الانفال: آیت: 60 (وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ)

[2] ۔ کنز العمال۔ جلد ہشتم: رقم: 4285 (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حکمت کی بات مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے۔ لہٰذا اسے جہاں بھی پائے وہی اس کا مستحق ہے)

علمی جمود اور ذہنی اضمحلال اس وقت صرف ترکی اور اس کے علمی اور دینی حلقوں کی خصوصیت نہیں تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ پورا عالم اسلامی مشرق سے مغرب تک ایک علمی انحطاط کا شکار تھا۔ دماغ تھکے تھکے سے اور طبعتیں بجھی بجھی سی نظر آتی تھیں۔ اگر ہم احتیاطاً آٹھویں صدی سے اس ذہنی اضمحلال کی ابتداء نہ کریں تو اس میں شک نہیں کہ نویں صدی ہجری وہ آخری صدی تھی جب جدت فکر، قوت اجتہاد اور ادب وشاعری، حکمت وفن میں ندرت اور تخلیق کے آثار نظر آتے ہیں۔ پچھلی صدیوں کے علماء کے تذکرے اور کتب سوانح پڑھیے۔ سینکڑوں ناموں میں ایک ایسے شخص ملنا مشکل ہوگا جس پر عبقری (genius) کے لقب کا اطلاق درست ہو یا جس نے کسی موضوع پر کوئی نئی چیز پیش کی ہو۔ پچھلی صدیوں میں ہم صرف چند افراد کا استثناء کر سکتے ہیں جو اپنے زمانہ کی عام علمی وذہنی سطح سے بہت بلند تھے[1]۔

یہ طویل اقتباس یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ المناک صورت آج بھی ویسی ہی ہے جو سلطنت عثمانیہ کے بارے میں تھی۔ آج بھی وہی جمود ہے۔ وہی بے خبری ہے۔ آج بھی وہی خطرات ہیں۔ آج بھی وہی تھکاوٹ واضمحلال ہے۔ آج بھی کوئی باہمت مرد نہیں ہے۔ ہم نے پانچ سو سال میں کوئی بھی عبقری (genius) پیدا نہیں کیا۔ آپ یورپ کی فہرست دیکھیں۔ سائنس میں آپ کو کاپرنیکس (Copernicus, d. 1543)، برونو (Bruno, d. 1600)، کیپلر (Kepler, d. 1630)، گیلیلیو (Galilio, d. 1645)، نیوٹن (Newton, d. 1727)، ڈارون (Darwin, d.

[1] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر از سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ صفحہ نمبر 189

(Bacon, d. 1294) ملتے ہیں۔ فلسفہ میں بیکن (Einstein, d. 1955) [1] 1882) اور آئن سٹائن

Kant, d.) ،کانٹ (Voltaire, d. 1778) [2] ، والٹیر (Hume, d. 1776) ، ہیوم

(Schopenhauer, d. 1860) [4] ، شوپنہار (Hegel, d. 1831) [3] ، ہیگل (1804 ، نطشے

(Bergson, d. 1941) [6] اور برگساں (Nietzsche, d. 1900) [5] ملتے ہیں۔ معاشیات

---

[1]۔ Albert Einstein؛ البرٹ آئن سٹائن (1879ء-1955ء)، بیسویں صدی کا سب سے بڑا طبیعیات دان سمجھا جاتا ہے۔

[2]۔ Voltaire؛ والٹیر (1694ء-1778ء) ایک روشن خیال فرانسیسی فلسفی تھا۔ وہ ایک شاعر، ناول نگار، ڈرامہ نویس اور تاریخ دان بھی تھا۔ انسانی حقوق کے شعور اور انقلاب فرانس کے لیے اس کا کردار بہت اہم ہے۔ اس کی تحریریں انقلاب فرانس کا سبب بنیں۔

[3]۔ Friedrich Hegel؛ ہیگل (1770ء-1831ء) ایک مشہور جرمن فلسفی تھا۔ جس نے تاریخ، سیاسیات، مذہب، آرٹس، منطق اور مابعد ازطبیعیات پر کتب تحریر کیں۔ اس کی کتابیں بعد میں روشن خیالی کی تحریک کا سبب بنیں۔

[4]۔ Arthur Schopenhauer؛ شوپن ہاور (1788ء-1860ء) ایک قنوطی جرمن فلسفی تھا۔ 19 ویں صدی کے ابتدائی عشروں میں انقلاب فرانس اور نپولین کی جنگوں کی وجہ سے یورپ میں آئی افراتفری اس کے نظریات میں نظر آتی ہے۔ اس نے اپنے نظریات کو اپنی کتاب The World as Will and Idea میں پیش کیا۔

[5]۔ Friedrich Nietzsche؛ فریڈرک نطشے (1844ء-1900ء) جرمن فلسفی تھا جس نے فوق البشر (superman) کے تصور کو آگے بڑھایا۔

[6]۔ Henri Louis Bergson؛ ہنری برگساں (1859ء-1941ء) فرانسیسی فلسفی اور مشہور حکیم تھا۔ اسے 1927ء میں ادبیات کا نوبل انعام دے گیا۔ برگساں ثنویت کا قائل تھا۔ یعنی عالم میں دو مستقل جوہر، زندگی اور مادہ ہیں جو آپس میں برسر پیکار رہتے ہیں۔ زندگی ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے اور ہمیشہ اوپر کی سمت جاتی ہے۔ وہ ایک فعال اور متحرک قوت ہے جو بیک وقت مادے کے اندر اور مادے سے ماوراء کر گہرائی، لطافت، تنوع اور پیچیدگی کے لیے تڑپتی ہے۔

میں آدم سمتھ (Adam Smith, d. 1790)، ریکارڈو (Ricardo, d. 1823)، مالتھس[1] (Malthus, d. 1834)، مارکس (Marx, d. 1883) اور کینز[2] (Keynes, d. 1946) ملتے ہیں۔ ادب میں شیکسپیئر (Shakespeare, d. 1616)، ملٹن[3] (Milton, d. 1674)، کیٹس[4] (Keats, d. 1821)، شیلے (Shelley, d. 1822)، ورڈزورتھ (Wordsworth, d. 1850)، وکٹر ہیوگو[5] (Victor Hugo, d. 1885) اور ٹالسٹائی[6] (Tolstoy, d. 1910) ملتے ہیں۔ نفسیات میں ولیم جیمز[7] (William James, d. 1910)، ایڈلر[8] (Adler, d.

---

[1]- Thomas Robert Malthus؛ تھامس رابرٹ مالتھس (1766ء-1834ء) معروف برطانوی ماہر معاشیات تھا۔ اس نے آبادی کے لیے اپنا مشہور نظریہ پیش کیا۔ اس کے مطابق جلد یا بدیر قدرت حرکت میں آتی ہے، تباہی اور زلزلوں کے ذریعے آبادی پھر سے وسائل کے مطابق ہو جاتی ہے۔

[2]- John Maynard Keynes؛ جان مینارڈ کینز (1883ء-1946ء) ایک انگریز ماہر معاشیات اور فلسفی تھا۔

[3]- John Milton؛ جان ملٹن (1608ء-1674ء) ایک معروف انگریزی شاعر تھا۔

[4]- John Keats؛ جان کیٹس (1795ء-1821ء) انگریزی ادب کا ایک عظیم شاعر اور رومانوی تحریک کی ایک اہم شخصیت تھا۔ اس کی خوبصورت شاعری حسوں کو متاثر کرتی ہے۔

[5]- Victor Marie Hugo؛ وکٹر ہیوگو (1802ء-1885ء) فرانسیسی شاعر، ناول لگار اور ڈرامانویس تھا۔

[6]- Count Lev Nikolayevich Tolstoy؛ ٹالسٹائی (1828ء-1910ء) روسی ناول نویس اور فلسفی تھا۔

[7]- William James؛ ولیم جیمز (1842ء-1910ء) امریکی ماہر نفسیات، فلاسفر اور سرجن تھا۔

[8]- Alfred Adler؛ آلفرڈ ایڈلر (1870ء-1937ء) آسٹریا کا مشہور ماہر علاج امراض نفسی تھا۔ اس نے انفرادی نفسیات (Individual Psychology) کے مکتب کی بنیاد رکھی۔

1937)، فرائڈ[1] (Freud, d. 1939) اور یونگ[2] (Jung, d. 1961) ملتے ہیں۔

یہ فہرست بہت طویل ہے۔لندن میں آپ کسی محلے میں چلے جائیں تو آپ کو گلی میں ایک نیلے رنگ کی تختی ملے گی۔ جس پر لکھا ہوگا کہ وہ سائنسدان اس گھر میں فلاں سال سے فلاں سال تک رہا۔اس گھر کو اس طرح محفوظ کیا گیا ہوگا کہ جیسے وہ سائنسدان ابھی چند لمحے کے لیے کہیں باہر گیا ہے۔اس کا سارا سامان وہاں موجود ہے۔ہم نے دین کی احیاء کے نام پر سعودی عرب میں اپنے اکابرین کے سارے نشانات مٹا دیئے ہیں۔صدیوں کا خزانہ چند دنوں میں برباد کر دیا۔اس سے بڑی بدتہذیبی اور جہالت کیا ہوسکتی ہے۔

عہد حاضر میں بہت سے مسائل ایسے ہیں جو اجتہاد کا تقاضا کرتے ہیں۔علماء کرامؒ کے لیے میں چند مسائل کی نشاندہی کرر ہا ہوں۔

(i) مسلم اقلیتیں

جن ممالک میں مسلمان اقلیت (minority) میں ہیں۔ان کا وہاں رویہ کیا ہونا چاہیے؟ کیا وہاں کے قانون کی اطاعت ان پر فرض ہے؟ ہماری فقہ اس وقت لکھی گئی ہے جب مسلمان غالب تھے۔ اس لیے تمام مسائل میں زیادہ تر مسلمانوں کو حاکم تصور کیا گیا ہے۔مسلمان بطور اقلیت کے فقہ کا موضوع نہیں ہیں۔ اس کا نقصان یہ ہے کہ اقلیتی مسلمان بھی اکثریتی ذہنیت (majority mentality) کا شکار ہیں۔جس سے بہت سنجیدہ مسائل پیدا ہوئے اور ہو رہے ہیں۔خصوصاً یورپ

---

[1]- Sigmund Freud سگمنڈ فرائڈ (1856ء-1939ء) کو جدید نفسیات کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

[2]- Carl Gustav Jung؛ یونگ (1875ء-1961ء) سوئس ماہر نفسیات تھا۔

امریکہ وغیرہ میں اس سوچ سے مسلمانوں اور اسلام سے متعلق منفی سوچ پیدا ہو چکی ہے۔

بی بی سی ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں حزب التحریر[ا] کے سابق سربراہ جناب عمر بکری صاحب کا ایک انٹرویو آیا جس میں اس نے کہا کہ یہ میرے ایمان کا حصہ ہے کہ میں 10 ڈاؤننگ سٹریٹ (برطانوی وزیراعظم کا گھر اور دفتر) پر اسلام کا جھنڈا لہراؤں۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا یہ اسلام ہے؟ اس لیے کہ اس طرح کے طرزِ عمل سے وہاں آباد مسلمان اقلیتوں کے لیے خطرناک مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر یہ اسلام نہیں ہے تو ہمیں خوامخواہ اپنے لیے مسائل نہیں کھڑے کرنے چاہیں۔

(ii) اقلیتوں کے مسائل

مسلمان معاشروں میں اقلیتوں کے مسائل کیا ہیں؟ ہماری فقہ کی کتب ابھی تک نئی فتوحات کے تناظر میں اقلیتوں کو دیکھتی ہیں کہ وہ ذمی ہیں۔ ان کا لباس مختلف ہوگا۔ وہ خراج دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ اس بات کو از سرِ نو دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کیا یہی اصول پاکستان جیسے ملک میں بھی لاگو ہوں گے۔

عہد حاضر میں بین الاقوامی قانون نے اس ضمن میں بہت ترقی کر لی ہے۔ مسلمان ممالک کے دساتیر (Constitutions) میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ برابری کی بنیاد پر ہے مگر ہماری مذہبی سوچ اس کا ساتھ نہیں دے رہی۔ ہم جب اقلیتوں سے زیادتی کرتے ہیں تو قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہمارا تاثر (image) بہت خراب ہوتا ہے۔ نئے قومی و بین الاقوامی حالات و تناظر میں ہمیں اپنی فقہ پر از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ا۔ حزب التحریر ایک اسلامی خلافت کی احیاء کی تحریک ہے جس کی بنیاد تقی الدین النبہانی نے 1953ء میں رکھی۔

(iii) عورتوں سے متعلق قوانین

عورتوں سے متعلق قوانین ایک خاص سیاسی و سماجی پس منظر میں بنے ہیں۔قومی اور بین الاقوامی قانون نے پچھلے ہزار سال میں بہت ترقی کر لی ہے۔ ہمارے مذہبی قوانین نے ان کے مطابق اپنے آپ کونہیں ڈھالا۔تاثر (perception) یہی بن گیا ہے کہ عورت اسلام میں مرد کے برابر نہیں ہے۔اس کے حقوق برابرنہیں ہیں۔یہ تاثر حالانکہ بالکل غلط ہے۔

اسلام انسانی عظمت و برابری کا دین ہے۔ہمیں چاہیے کہ عورتوں کے متعلق قوانین کا جائزہ لیں۔ خصوصاً دوسری شادی کے متعلق قوانین، گواہی سے متعلق قوانین، حدود کے متعلق قوانین وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کیا ہم نے اپنی عورت کو اپنے سماجی و مذہبی عمل سے بجاطور پر بے دخل کیا ہے یا یہ ہماری جذباتیت ہے؟

(iv) معاشی معاملات

معاشی معاملات میں بھی ہم قرون اول (first period) میں پھنسے ہوئے ہیں۔معاشی معاملات نے پچھلے چارسوسال میں اپنی شکل بالکل بدل لی ہے۔معاش نے نہ صرف مقامی سطح پر اپنی شکل بدل لی ہے بلکہ اس نے اب بہت حد تک بین الاقوامی بہت اختیار کر لی ہے۔معاشی نظام میں مسئلہ سود (interest) کو بہت اہمیت حامل ہے۔یہ عہد حاضر کا لازمہ بن گیا ہے۔ہم اس کوحرام تو کہتے ہیں لیکن اس کے متبادلات (alternatives) پر توجہ نہیں کرتے یا پھر صرف حیلہ و بہانہ کر کے سود کو ہی حلال مان لیتے ہیں۔

یہ معاملہ بہت سنجیدہ سوچ کا تقاضا کرتا ہے کہ سود سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ مطلقاً (absolutely)

حرام ہے یا اس کی کچھ قسمیں حرام ہیں؟ بین الاقوامی تجارت میں اس کا کیا کردار ہے؟ اگر سود بالکل حرام ہے تو جدید بینکاری کے نظام کو کیسے چلایا جائے؟ مضاربہ[1] کو کیسے چلایا جائے؟ انشورنس و دیگر فنڈز کے مسائل کیسے حل کیے جائیں؟ لوگوں سے بچتیں کیسے وصول کی جائیں؟ ان کی حفاظت اور استعمال کیسے ہو؟ روپے کی قدر میں کمی (depreciation) سے لوگوں کو نقصان سے کیسے بچایا جائے۔ غیر مسلموں سے لین دین کیسے ہو۔ ان معاملات پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور کی ضرورت ہے۔

(۷) قانون

قانون خاص طور پر مسلمانوں کا شعبہ تھا۔ عہد اول میں فقہ کی تدوین (compilation) اس کا بین ثبوت ہے۔ قانون ایک زندہ عمل ہے جو حیاتیاتی ارتقاء (biological evolution) کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جوں جوں زندگی پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی جا رہی ہے۔ قانون بھی پھیلتا جا رہا ہے۔ ہم ابھی تک ہزار سال پہلے والے قانونی پس منظر اور فریم ورک میں چل رہے ہیں جو عہد حاضر کے لیے بالکل ناکافی ہے۔

نئے دور میں بہت سے علوم نئے آئے ہیں۔ زندگی کے بعض شعبوں میں بے انتہا ترقی ہوئی ہے لیکن ہم نے ان کو نظر انداز کیا ہے۔ بینکنگ، انشورنس، مواصلات وغیرہ اس کی چند مثالیں ہیں۔ ان اہم مگر پیچیدہ معاملات میں ہمارے پاس کوئی دینی راہنمائی میسر نہیں ہے بلکہ ظلم تو یہ ہے کہ ہم اس مسئلہ کو مسئلہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

۱۔ مضاربہ تجارت کی ایک قسم ہے جس میں ایک شخص اپنا مال کسی دوسرے شخص کو اس شرط پر تجارت کی غرض سے دیتا ہے کہ نفع میں باہمی معاہدہ کے مطابق دونوں شریک ہوں گے اور نقصان مال والا برداشت کرے گا۔

ہماری فقہ میں فوجداری قانون ایک ذاتی معاملہ ہے۔ جدید اصول قانون نے اس ضمن میں اب بالکل دوسرا رویہ اختیار کرلیا ہے۔ دیوانی (civil) معاملات انسان کے ذاتی معاملات ہیں۔ جبکہ فوجداری (criminal) معاملات اب فرد اور ریاست کے درمیان تصور کیے جاتے ہیں۔ اس لیے اکبر اگر امام بخش کو قتل کرے تو جب مقدمہ چلتا ہے تو اسے سرکار بنام اکبر کے نام سے عدالت میں پکارا جاتا ہے یعنی اکبر نے ریاست یا سوسائٹی کے خلاف جرم کیا ہے اور ریاست اپنے لیے اور امام بخش کے لیے اکبر سے انتقام لینا چاہتی ہے یا سزا دینا چاہتی ہے۔

ہماری فقہ جب تشکیل ہوئی ہے تب قانون میں یہ تقسیم نہ تھی۔ اب یہ تقسیم مسلمہ ہے۔ ہم جب قتل کو بھی ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں تب ولی کو مجرم کی معافی کا حق مل جاتا ہے۔ عہد حاضر کے کچھ علماء نے اس ضمن میں خاصی پیش رفت کی ہے لیکن اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اصول قانون کے اس مسئلہ پر سنجیدہ غور وخوض کیا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ کیا عہد حاضر میں اس طرح کے کچھ فوجداری جرم فساد فی الارض (public disorder) کی شکل میں آتے ہیں؟ جہاں ریاست بھی فریق ہے؟

یہ فرق بہت اہم ہے۔ اس اصول کے مان لینے سے ہمیں اپنے بہت سے قوانین بدلنے پڑیں گے۔ اسلام ویسے بھی معروف[1] (customs) پر بہت زور دیتا ہے۔ قرآن اس سلسلے میں بہت واضح ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 772) اسی ضمن میں بہت مشہور ہیں۔

(vi) دینی و دنیاوی تعلیم

یہ پہلو بھی غور طلب ہے کہ کیا دینی اور دنیاوی تعلیم الگ ہے یا علم ایک وحدت ہے؟ کیا سائنس کی

---

[1] معروف عرف پر مبنی معاملات کو کہتے ہیں عرف وہ چیز ہے جو کسی سماج میں اچھی سمجھنے کی وجہ سے رچ بس جائے اور سلیم طبیعت اسے قبول کرلے۔

تعلیم اتنی ہی لازم ہے جتنی کہ فقہ کی؟ ہم دینی تعلیم کو ثواب اور دنیاوی تعلیم کو بعض اوقات گناہ اور بعض اوقات حقیر تر سمجھتے ہیں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارے دیندار لوگ جدید تعلیم کے دائرے سے نکل گئے۔ دوسرے صالح عناصر نے بھی ایک منفی ذہن بنالیا جس سے وہ ترقی سے مزید دور چلے گئے۔ یہ ہم سب کے لیے حیات وموت کا مسئلہ ہے اور ایک کلی اجتہاد چاہتا ہے۔ اس روشنی میں ہمیں نصاب تعلیم بدلنا پڑے گا۔ طرز تدریس بدلنا پڑے گا۔

یہ صرف چند امور ہیں جن کی طرف اصولاً توجہ دلائی گئی ہے۔ اسلامی ممالک کی تنظیم (OIC) کو چاہیے کہ پہلے موضوعات منتخب کرے۔ ان پر مختلف سوالنامے ترتیب دیئے۔ یہ سوالنامے اور موضوعات (consensus) علما وفضلاء کی خدمت میں بھیجے۔ علما وفضلاء سے ان کی تحریری مقالہ جات وصول کر کے ان کو باقی تمام علما کو بھیجے تا کہ وہ دوسروں کی آرا سے مستفید ہو سکیں۔ پھر ان علما کی کانفرنس بلائے تا کہ وہ اکٹھے بیٹھ کر باہمی مشورہ کر سکیں اور ایک مشترکہ یا جمہوری رائے قائم کر سکیں۔ یہی کام مسلمان ممالک، رابطہ عالم اسلامی، موتمر عالم اسلامی یا بڑے دینی ادارے بھی کر سکتے ہیں اور عہد حاضر میں اس طریقہ کار سے جدید مسائل پر تحقیق وترقی یا مسلمانوں کا اجماع[1] قائم کیا جا سکتا ہے۔

---

[1]۔ اجماع امت مسلمہ کے مجتہدین کے اس اتفاق کا نام ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد کسی زمانہ میں کسی بھی بات پر ہوا ہو۔

13۔ دعوت

(i) ضرورت

ہمارا دین اللہ عزوجل کا آخری پیغام ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام و حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہوتا ہوا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مکمل ہوا اور قرآن مجید نے واضح اعلان کر دیا کہ

اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا[1]

(آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین کی حیثیت سے اسلام کو تمہارے لیے پسند کر چکا)

ایک طرف تو خالق کائنات کا یہ اعلان ہے کہ میں نے دین مکمل کر دیا ہے اور اس بات کو اب چودہ سو سال سے زائد ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف زندگی اپنی رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے۔ صبح ہوتی ہے۔ شام ہوتی ہے۔ حیات و زمانہ آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ میرے اور آپ کے کہنے سے نہیں رکتا۔ حضرت اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے:

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی[2]

۱۔ سورۃ المائدہ: آیت: 3

۲۔ زندگی؛ بانگ درا از محمد اقبالؒ

اب دو اصول ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ دین مکمل ہو گیا ہے اور وہ رہتی دنیا تک کے لیے راہنمائی ہے۔ دوسرے یہ کہ زمانہ بدل رہا ہے۔ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تقاضے بھی بدل رہے ہیں۔ ان دو اصولوں کی تطبیق (application) اس طرح ہے کہ زندگی کی حرکت کا ساتھ دینے کے لیے دین نے دو عمل بتائے ہیں۔ اول اجتہاد اور دوسرے دعوت۔

دعوت کی ضرورت اس لیے بھی پیش آتی ہے کہ نئے نئے چیلنج سامنے آتے رہتے ہیں۔ مختلف زمانوں میں مختلف انداز سے دین اسلام کے قلب وجگر پر حملے ہوتے رہے ہیں۔ آج کل بھی جہاں عمومی فتنے کا زمانہ ہے وہاں نئی صلیبی یلغار (crusades) ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کی مسلسل بہتری کے لیے بھی یہ عمل لازم ہے۔

اجتہاد پر پہلے گزارشات ہو چکیں ہیں۔ اس لیے اب بھی اصلاح وتجدید کے لیے دعوت پر کچھ گزارشات کروں گا:

(ii) امامت

قرآن پاک میں ارشاد ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ [1]

(اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو۔ بدی سے روکتے ہو)

۱۔ سورۃ آل عمران: آیت: 110

یہ آیت شریفہ واضح کرتی ہے کہ اب دنیا کی امامت اور راہنمائی پر مسلمان مامور ہیں۔ اب اخلاق و اعمال کے لحاظ سے ہمیں دنیا میں سب سے بہتر گروہ بننا ہے۔ وہ تمام صفات پیدا کرنا ہیں جو امامت کے لیے ضروری ہے۔ ہم نے نیکی کو قائم کرنا ہے اور بدی کو مٹانا ہے۔ یہ کام اب ہمیں سپرد کیا گیا ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا[۱]

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا[۲]

(اسی طرح ہم نے تمہیں ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو)

یہ آیت شریفہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دنیاوی امامت کا اعلان ہے۔ امت وسط (middle community) سے مراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے جو عدل و انصاف اور درمیانے راستہ پر قائم ہو۔ جو دنیا کی قوموں کے لیے قائد کی حیثیت رکھتا ہو۔ امت وسط اس لیے بنایا گیا ہے کہ مسلمان لوگوں پر گواہ ہیں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں پر گواہ ہیں۔ یعنی روز حساب حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گواہی دیں گے کہ انہوں نے حق و عدل کی تعلیم انسانوں تک پہنچا دی تھی اور اس

۱۔ طلوع اسلام؛ بانگ درا از محمد اقبالؒ

۲۔ سورۃ البقرۃ: آیت: 143

کے بعد مسلمان پوری دنیا کے بارے میں گواہی دیں گے کہ انہوں نے خدا اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام پوری انسانیت تک پہنچا دیا ہے[1]۔

یہ امامت اور دعوت دنیا کا بہترین کام ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ [2]

(اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں)

دعوت کا عمل ایمان لانے سے آگے کا درجہ ہے اور اس سے زیادہ اعلیٰ کوئی درجہ نہیں ہے۔ اچھے عمل کرتے ہوئے لوگوں کو اپنے خالق کی طرف بلانا سب سے بہتر بات ہے۔

(iii) حکمت

دعوت حکمت کے ساتھ دینی ہے اور نصیحت کے لیے دینی ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ [3]

(اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت و حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو)

---

[1]۔ تفہیم القرآن از مولانا مودودیؒ بحوالہ سورۃ البقرۃ: آیت: 143

[2]۔ سورۃ فصلت: آیت: 33

[3]۔ سورۃ النحل: آیت: 125

بے وقوفوں کی طرح دعوت نہیں دینی بلکہ دانائی کے ساتھ دینی ہے۔ موقع ومحل دیکھنا ہے۔ عقل کا استعمال کرنا ہے۔ سننے والے کی نفسیات کا خیال رکھنا ہے۔ انسانی نفسیات کا خیال رکھنا ہے۔ عقل کے ساتھ ساتھ انسان کے اعلیٰ جذبات کو بھی مخاطب کرنا ہے۔

(iv) دل سوزی

دعوت دل سوزی سے دینی ہے۔ اصلاح کے لیے تڑپ ہونی چاہیے اور یہ تڑپ لوگوں کو محسوس ہونی چاہیے۔ یہی نبوی مزاج ہے۔ سورۃ الشعراء میں ارشاد ہے:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ[1]

(اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شائد آپ اس غم میں اپنی جان کھودو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے)

ایسا ہی مفہوم سورۃ الکہف میں ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی قوم کی گمراہی اور اس کی اخلاقی پستی کو دیکھ دیکھ کر رنجیدہ ہوتے تھے۔ اللہ عزوجل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دیتے تھے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا[2]

(اگر یہ لوگ اس قرآن پر ایمان نہ لائے تو لگتا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرطِ غم سے ان کے پیچھے جان دے دیں گے)

(v) مقصد

دین کے لیے دعوت دینے کو ہی زندگی کو مقصد بتایا گیا ہے۔ حضر یوسف علیہ السلام نے اعلان فرمایا کہ

---

[1] سورۃ الشعرا: آیت:3

[2] سورۃ الکہف: آیت:6

قُلۡ هٰذِهٖ سَبِيۡلِيۡۤ اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ ؔ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ[1]

(میرا راستہ تو یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں۔ پوری بصیرت کے ساتھ)

زندگی کا مقصد عہدہ اور جائیداد نہیں بلکہ دعوت ہے۔ دعوت ہر مسلمان کا فرض ہے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد ہونا چاہیے۔ حضرت اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے:

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے، جام رہے[2]

کم از کم درجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک واضح جماعت یہ کام کرے:

وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ[3]

(تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہییں جو نیکی کی طرف بلائیں۔ بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے)

دعوت کا یہ عمل دوسرے کے لیے نہیں ہے۔ اس سے داعی کی اپنی اصلاح ہوتی ہے۔ دعوت کے مخاطبین کی اصلاح ہوتی ہے۔ دعوت کے مخاطبین (addressees) مسلمان بھی ہوں گے اور غیر مسلم بھی ہوں گے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کو ایک خوبصورت مثال سے واضح کیا

---

[1] ۔سورۃ یوسف: آیت:108

[2] ۔شکوہ؛ بانگ درا از محمد اقبالؒ

[3] ۔سورۃ آل عمران: آیت:104

ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس شخص کی مثال جو اللہ تعالیٰ کی حدود پر قائم ہے اور اس شخص کی جو اللہ تعالیٰ کی حدود میں پڑنے والا (اللہ عزوجل کے حکم کے خلاف ورزی کرنے والا) ہے۔اس قوم کی سی ہے جو ایک جہاز میں بیٹھے ہوں۔قرعہ سے جہاز کی منزلیں تقسیم کر لی جائیں۔ کچھ لوگ اوپر والی منزل میں ہوں اور کچھ نیچے والی منزل میں ہوں۔جب نیچے والوں کو پانی کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ جہاز کے اوپر والے حصے میں جا کر پانی لیتے ہیں۔اگر وہ یہ خیال کر کے کہ ہمارے بار بار اوپر جانے سے اوپر والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔اس لیے ہم اپنی نچلی منزل میں ایک سوراخ سمندر میں کھول لیتے ہیں تاکہ پانی لے سکیں۔اگر اوپر والے نیچے والوں کو اس احمقانہ تجویز سے نہیں روکیں گے تو جہاز غرق ہو جائے گا اور دونوں گروہ ڈوب جائیں گے۔اگر ان کو روکیں گے تو دونوں بچ جائیں گے[1]۔

اس حدیث شریف سے یہ بات واضح ہے کہ مسلمانوں کی بقا اس میں ہے کہ وہ لوگوں کو برائی سے روکیں ورنہ وہ خود بھی مٹ جائیں گے۔جب ہم دوسروں کو دعوت دیں گے تو دین سب سے پہلے ہماری اپنی زندگیوں میں آئے گا۔ایمان کی بہار آئے گی۔

دین کا یہ وہ پہلو ہے جو ہم نے نظر انداز کر رکھا ہے۔اس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔جو لوگ دین کا کام کرتے ہیں۔وہ احسان سمجھتے ہیں اور حکمت نہیں رکھتے۔نصیحت نہیں کرتے۔کلام میں نرمی نہیں کرتے۔جز وقتی کام کرتے ہیں۔زندگی کا مقصد نہیں بناتے۔ہمیں چاہیے کہ ہم تمام بحیثیت قوم اس پر غور کریں خصوصاً علماء اور اہل فکر پر تو یہ انتہائی لازم ہے۔

---

[1]۔صحیح بخاری۔جلد اول:رقم:2393

۷

اختتامیہ

انسانی زندگی میں ہر لحہ تبدیلی آتی رہتی ہے۔ حرکت، حیات کا بنیادی اصول ہے۔ اسلام دین فطرت ہوتے ہوئے مثبت اور جامع (comprehensive) تبدیلی کا دین ہے اور تبدیل نہ ہونے والی حقیقتوں پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ ہر لحظہ جد و جہد پر مجبور کرتا ہے۔

عہد اول میں مسلمانوں نے اپنے عہد کے ہر چیلنج کا مناسب جواب دیا بلکہ انسانیت کی فکری و عملی قیادت کی۔ انسانی تہذیب پر بہت گہرے اور انمٹ نقوش چھوڑے۔ مگر پھر جمود (intentive) کا شکار ہو گئے۔ وقت کی تبدیلی کا ساتھ نہ دے سکے اور زمانہ انہیں پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گیا۔ اب مسلمان تین میں ہیں نہ تیرہ میں۔ غربت، جہالت، ذلت، مسکنت اور بے بسی ان کا مقدر ہے۔

ہم پر لازم ہے کہ اس صورت حال کا ٹھنڈے دل سے گہرا مطالعہ کریں۔ خود احتسابی کے عمل سے گزریں۔ فی الحال غیروں کی سازشوں کا رونا چھوڑ دیں۔ اپنے گریباں میں جھانکیں کہ ہم سے کون سی غلطیاں ہوئی ہیں؟ ان کا ازالہ کیسے ممکن ہے؟ ہم کیسے صاحب عزت ہو سکتے ہیں؟

اگر ہماری فکر اصلاح طلب ہے یا حالات کے مطابق تبدیلی چاہتی ہے تو ہمیں اپنی فکر جلد تبدیل کر لینی چاہیے۔ اگر عمل اصلاح طلب ہے تو اس کی بہتری میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اس سے وقت بچے گا۔ ہم نے فکر کی تبدیلی کے راستے ہی بند کر دیئے ہیں۔ علم سوال سے بڑھتا ہے۔ بحث سے بڑھتا ہے۔ ہم نے سوال کرنے کو برا عمل بنا دیا ہے۔ یہ اچھا عمل تھا جو ہماری جہالت سے برا عمل بن گیا ہے۔ ہم نے تمام علماء کو رازی دوران اور غزالی زمان، شیخ طریقت و رہبر شریعت جیسے القابات دے دیئے ہیں۔ یہ اتنے بھاری

بھر القابات ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ہم سوچنے کی اور تنقید کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔

قرآن مجید کے ترجمے کو ہم نے کفر سمجھا۔ ہندوستان میں پہلا فارسی ترجمہ فارسی شاہ ولی اللہؒ نے اٹھارویں صدی میں کیا ہم نے تقریباً گیارہ سو سال اپنے لوگوں کو قرآن پاک کے ترجمے سے محروم رکھا۔ کیوں محروم رکھا۔ کیا شاہ ولی اللہؒ نے کفر کیا؟ اگر شاہ ولی اللہؒ نے کفر نہیں کیا تو ہم نے پہلے ترجمہ کیوں نہیں کرنے دیا یا کیوں نہیں کیا؟

ہم نے چودہ سو سال تک مفقود الخبر[1] (جس کی خبر نہ ہو) خاوند کے بارے میں اپنی رائے نہ بدلی۔ چند سال پہلے اسلامی نظریاتی کونسل کی رائے کے بعد قانون بنا کہ یہ عمر سات کافی ہے۔ ستر یا اسی سال کی ضرورت نہیں۔ ہم نے یہ نہ سوچا کہ اتنی تو انسان کی عمومی طبعی عمر بھی نہیں ہے۔ دوسرے عورت کا کیا قصور ہے؟ کیا وہ انسان نہیں ہے؟ کیا اس کی خواہشات وضروریات نہیں ہیں؟ ان لاکھوں عورتوں کا کیا قصور تھا جن کو ہم نے صدیوں تک زندگی کی آسانی سے محروم رکھا اور اسلامی قانون کے نام پر ان کو جائز انسانی ضرورتوں کی تکمیل سے محروم رکھا۔

ہم نے سو سال تک لاؤڈ سپیکر کو حرام کہا اور اب اتنا حلال ہوا ہے کہ کوئی بھی عالم دین سپیکر کے بغیر تقریر نہیں کرتا۔ محلے میں سپیکر کی برکت سے کوئی مریض محفوظ ہے نہ کوئی طالب علم۔ اب سپیکر کیسے حلال ہو گیا، اگر کل یہ حرام تھا؟ قرآن مجید کی مشینی پرنٹنگ کو ہم نے کئی سو سال تک حرام کہا حالانکہ حقیقت اس کے بالکل الٹ ہے۔ حضرت اقبالؒ کے بقول:

۱۔ مفقود الخبر سے مراد وہ شخص ہے جو لاپتا ہو جائے اور یہ بھی معلوم نہ ہو سکے کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا[1]

اصل میں ہم تبدیلی کو قبول نہیں کرتے۔ یہ بنیادی بات ہے کہ بہت سے احکام کی تعبیر کا بہت حد تک دارومدار عہد کے معاشی وسماجی نظریات پر ہوتا ہے۔ جب یہ نظریات بدلتے ہیں تو تعبیر بھی بدل جاتی ہے۔ عقل مندی یہ ہوتی ہے کہ تبدیلی کو جلد قبول کر لیا جائے۔ بخوشی قبول کر لیا جائے اور ردعملی (reactionary) سوچ نہ اپنائی جائے۔ اس سے وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ معاشرے اور دنیا میں منفی رائے بن جاتی ہے۔ اسلام بدنام ہوتا ہے۔

ہمارے مذہبی طبقے میں یہ عجیب سوچ پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں پر تنقید اور اسلام پر تنقید میں بہت فرق ہے۔ زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اگر دین کی کچھ تعبیریں عہد حاضر کے مطابق نہیں ہے یا عہد ماضی میں بعض خاص حالات کی وجہ سے اختیار کی گئی ہیں تو تغیر کو سمجھا جائے۔ محکمات پر قائم رہتے ہوئے تغیر کے اصول کو قبول کیا ہے۔ بہتر تعبیر کو قبول کر لیا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ غلط رائے پر قائم رہنا اسلام کی حفاظت ہے۔ یہ سوچ بالکل غلط ہے۔ اس سے اسلام کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم نے عورتوں کی گواہی یا چار شادیوں میں کوئی افراط وتفریط کیا ہے یا ایک خاص مکتبہ فکر کی رائے قبول کر رکھی ہے جو عہد حاضر کے مطابق نہیں ہے تو اس کا فوراً جائزہ لینا چاہیے۔ یہی اسلام کی خدمت ہے۔ یہی انسانیت کی

---

[1] تخلیق؛ ضرب کلیم از محمد اقبالؒ

خدمت ہے اگر حدود[1] آرڈیننس میں کوئی غلطی ہے تو یہ حدود میں غلطی نہیں ہے۔ دونوں میں فرق ہے۔

ہم بالکل ردعمل کا شکار ہیں۔ اگر کوئی اصلاح کی تجویز آتی ہے تو ہم اس کو فوراً مسترد کر دیتے ہیں بلکہ اسلام پر حملہ سمجھتے ہیں۔ یہ اسلام کا دفاع ہرگز نہیں ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ آج کل کی فقہ حنفی وہ نہیں ہے جو امام ابو حنیفہؒ نے لکھی تھی بلکہ اکثر آراء ان کے شاگردوں (امام محمدؒ، امام ابو یوسف اور امام زفرؒ) کی ہیں۔ چونکہ تعبیر کے اصول امام ابو حنیفہؒ والے استعمال کیے گئے ہیں۔ اس لیے یہ بھی فقہ حنفی کہلاتی ہے۔ اس لیے عہد حاضر کے علما کو بھی حق ہے کہ انہی اصولوں کی روشنی میں نئی تعبیر کریں۔ ہماری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ہمارے علماء نے مختلف حالات میں آراء بدلی ہیں۔ عہد اول میں عورتوں کا مسجد میں نماز پڑھنا قبول تھا۔ بعد میں اس نیک عمل کو ہم نے نامناسب سمجھا۔ تین طلاقیں نا مناسب تھیں۔ بعد میں جائز قرار دے دی گئیں۔ اب بعض علماء نے تحریک چلائی ہے کہ طلاق مغلظہ (ایک وقت میں تین طلاقیں) کو ممنوع قرار دے دیا جائے۔

بعض لوگوں نے اسلام کو مسخ کر دیا ہے۔ اسلام امن کا دین ہے۔ انہوں نے اس کو خون کا دین بنا دیا ہے۔ اسلام شرف آدمیت کا دین تھا۔ وہ اس سے دوسروں کی تذلیل کرتے ہیں۔ اسلام انصاف کا دین تھا۔ وہ اس کو ظلم کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اسلام عورتوں کو بنیادی حقوق دینے والا دین تھا۔ وہ اس سے عورتوں کو حیوان بنانے پر تلے ہیں۔ اسلام انسانی ترقی کا دین تھا۔ آج اس کو غربت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

---

[1]۔ حدود سے مراد جرائم کی وہ سزائیں ہیں جنہیں اللہ پاک نے خود مقرر فرما دیا ہے۔ اب ان سزاؤں میں کوئی بھی انسان اپنی مرضی سے کوئی کمی یا بیشی نہیں کر سکتا۔ حدود اللہ کی تعداد انتہائی محدود ہے۔

ہماری عوام کا ایک طبقہ رسومات میں مست ہیں۔ بعض حکمران عیاشی میں مصروف ہیں۔ بعض اہل زر، زر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بعض دانش ور جاہلیت کے علمبردار ہیں۔ عالمی سطح پر ہماری داستانوں میں داستاں نہیں ہے۔ اب ہمیں مستی چھوڑنا ہوگی۔ غلامی سے نجات پانا ہوگی۔ خون جگر جلانا ہوگا۔ اعتماد ذات حاصل کرنا ہوگا۔ ترقی کرنی ہوگی۔

اصلاح کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ہم سب پر ہے۔ ہم نے اپنی صورت آپ مسخ کر لی ہے۔ ان حالات میں علماء کرام پر سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس لیے کہ وہ دین کے اعلیٰ تعلیمات کے علمبردار ہیں۔ وہ مسلمانوں کی اخلاقی حالت کے نگہبان ہیں۔ وہ اسلام کی شاندار روایات کے امین ہیں۔ اس طبقے نے حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ، حضرت امام ابن تیمیہؒ، حضرت امام غزالیؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کو پیدا کیا ہے۔ اس لیے میری رائے میں علماء کو چاہیے کہ سر جوڑ کر بیٹھیں۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ لگائیں۔ اس کے حل کا مناسب راستہ تجویز کریں۔ اسلام کی صحیح تعلیمات بیان کریں۔ تبدیلی کا ہراول دستہ بنیں۔ نئی نسل کو سنبھالیں۔

یہ سب کچھ ممکن ہے۔ مایوسی کفر ہے۔ تبدیلی حقیقت ہے۔ قوموں میں عروج و زوال آتا رہتا ہے۔ ہمارا زوال عروج بن سکتا ہے۔ اس کے لیے ہمیں محنت کرنی ہے اور غیر معمولی محنت کرنی ہے۔ اپنی ذات میں اور اپنی سوسائٹی میں انقلاب لانا ہے۔ مکمل انقلاب لانا ہے کہ انقلاب سے زندگی ملتی ہے۔ انقلاب سے قومیں باقی رہتی ہیں۔ ہمیں نقش و نگار دیر سے ہاتھ اٹھانا ہے۔ مردہ دلوں کو زندہ کرنا ہے۔ ذوق یقین پیدا کرنا ہے۔ اپنی خودی میں ڈوب جانا ہے۔ خون جگر جلانا ہے۔ آشفتہ سری کرنی ہے۔ تب جا کے یہ خواب حقیقت بنے گا۔

آب روانِ کبیر[1] تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نَو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب [2]

---

[1]۔آب رواں کبیر(Guadalquivir River)ایک دریا کا نام ہے جو مسجد قرطبہ کے ساتھ بہتا ہے۔
[2]۔مسجد قرطبہ؛ بال جبرئیل از اقبالؒ

آراء[1]

[1] یہ وہ آراء ہیں جو پہلے ایڈیشن میں چھپی تھیں۔

ظفر اللہ خان صاحب اپنی نوعیت کے ایک منفرد انسان ہیں۔قرآن مجید گہرا شغف، اسلامی علوم وفنون سے براہ راست واقفیت، دعوۃ وتبلیغ کا شوق، امت مسلمہ کے مستقبل کی گہری فکر، قانون اور دستور ہر وقت کا اوڑھنا بچھونا، انتظامی امور سے براہ راست تعلق اور ان سب سے بڑھ کر شعر وادب اور تصنیف وتالیف کا گہرا ذوق، یہ سب چیزیں اس مختصر سے وجود میں بیک وقت جمع ہیں۔ظفر اللہ خان صاحب کی مختلف سرگرمیوں میں ان متنوع جہتوں کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔زیر نظر کتاب دراصل ایک تقریر ہے جو انہوں نے دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں علمائے کرام کے سامنے کی تھی۔انہوں نے اس تقریر میں انتہائی دردمندی سے مسلمانوں کی درپیش چیلنجوں کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمان مشکلات کے اس دور سے کیسے نکل سکتے ہیں۔

جناب ظفر اللہ خان صاحب کے نزدیک جہالت، غربت، کمزوری اور دین کی غلط فہمی، اس وقت مسلمانوں کے سب سے بڑے مصائب ہیں۔انہوں نے کتاب کے پانچویں باب میں ان چاروں مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔کتاب کا چھٹا باب دراصل وہ دستور ہے جو فاضل مصنف کے نزدیک امت مسلمہ کو اختیار کرنا چاہیے۔یہاں مصنف نے ایک بارہ (12) نکاتی لائحہ عمل تجویز کیا ہے۔اس لائحہ عمل کے بنیادی نکات اور اساسی تصورات سے کلی اختلاف کسی کو بھی نہیں۔البتہ ترجیحات اور تفصیلات کے بارے میں ایک سے زائد آرا ہو سکتی ہیں۔دراصل یہی بات کتاب کی جان ہے۔بقیہ مختصر ابواب اس بات کی تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مصنف کو امت مسلمہ کی حالت زار پر جو گہرا دکھ ہے۔اس کا اظہار کتاب کے صفحے صفحے سے ہوتا ہے۔اس شدت احساس نے کہیں کہیں تلخ بیانی کا انداز اپنا لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے قارئین اس تلخ نوائی کو معاف فرمائیں گے۔

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

ڈاکٹر محمود احمد غازی

صدر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

سابق وفاقی وزیر برائے مذہبی امور، حکومت پاکستان

اسلام آباد

یکم اکتوبر 2004

میں لکھاری ہوں نہ ہی بڑا عالم کہ کسی کے تخلیق کے متعلق اپنی رائے دے سکوں پھر بھی ظفراللہ خان کا اصرار ہے کہ میں ان کے تفصیلی لیکچر پر کچھ نہ کچھ کہوں۔

ظفراللہ خان بیرسٹر بھی ہیں اور سی ایس پی بھی۔ اپنی سیمابی جبلتوں کی وجہ سے انہوں نے دامن پیشہ وکالت میں پناہ لی ہے۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں جو اسلام کے معاشی نظام، اخلاقی نظام اور جزاوسزا کے اصولوں پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ شروع سے لے کر آج تک انہوں نے غیرقانونیت، ناانصافی اور افسر شاہی کی فرعونیت کے خلاف جدوجہد کی ہے۔ انہوں نے اپنے سرکاری ملازمت کے دور میں اعلیٰ آفیسروں کے غیرقانونی اور ظالمانہ احکامات کے خلاف ہمیشہ دلیری سے نہ صرف بغاوت کی ہے بلکہ ان کے احکامات کی تکمیل کرنے سے انکار کردیا۔ اس باغیانہ رویے کو غلام گردش نظام نے قبول نہیں کیا۔ آج وہ پرآسائش ملازمت کی وادی سے نکل کر قانون کے خاردار میدان میں اپنے جوہر دکھا رہے ہیں۔ یہ لیکچر بھی ان کی عادات اور فطری جبلتوں کا شاہکار ہے۔

پوری محنت سے، پورے خلوص سے، پورے یقین سے انہوں نے امت اسلامیہ کی حالت اور مصائب کا رنج وکرب کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان کے خیالات سے مفر ممکن نہیں۔ آج ملت اسلامیہ جن وجوہات کی بنیاد پر زوال پذیر ہے۔ وہ بالکل روزروشن کی طرح ہم پر واضح ہیں۔ آج ہمارے پاس علم ہے نہ تحقیق اور نہ ہی حکومت میں شورائیت کا کہیں وجود ہے۔ آج ہم دنیا میں بغیر کسی وجود کے ہیں بلکہ مغربی قوتوں کے کاسہ لیس ہیں۔

ایک چیز جس کا میں اضافہ کرنا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ سچائی اور جھوٹ، عدل اور ظلم، یہ انسانی فطری

جبلتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان خالق کائنات کی ایک عجیب اور پیچیدہ شاہکار تخلیق ہے۔ انسان میں بیک وقت نفرت اور پیار، ظلم اور رحم، لالچ اور قربانی، دوسروں کے حقوق غصب کرنے کی خواہش اور دوسروں کو حق دلانے کی خواہش، اس طرح کی کروڑوں متضاد جبلتیں موجود ہیں۔ تخلیق آدم سے اب تک ان جبلتوں کی آپس میں نہ ختم ہونے والی لڑائی سے دنیا کی تاریخ میں بربریت کی عملداری رہی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس نا ختم ہونے والی جدوجہد میں انصاف قائم کرنے والی قوتیں ناکامیاب اور نامراد رہی ہیں۔ چنگیز خان، ہٹلر اور مغربی سامراج ان حقائق کا واضح ثبوت ہیں۔

رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کی کہانی علم کی کہانی ہے۔ پیار کی کہانی ہے۔ محبت کی کہانی ہے۔ اس نظام میں شورائیت، کلیدی اہمیت کی حامل ہے۔ بغیر شورائیت کے اسلام کا نظام معیشت، اسلامی مساوات کے اصول اور نہ ہی اسلام کی بنیادی انسانی عظمت کا حکم سرخرو ہو سکتا ہے۔ اسلام کے محبت کے اصول، انسانی مساوات کے اصول، بنیادی حقوق کے اصول، معاشیات کے اصول کبھی بھی ملوکیت اور آمریت کے نظام میں قائم ہو سکتے ہیں اور نہ ہی پرورش پا سکتے ہیں۔

میں ظفر اللہ خان کی زوال امت سے متعلق اخذ کردہ وجوہات سے پوری طرح متفق ہوں۔ خداوند کریم ان کو علم کی دولت سے مزید مالا مال کرے تاکہ وہ پوری قوت سے اپنے مشن کو جاری رکھیں اور امت کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے لیے کام کر سکیں۔

میاں اللہ نواز
سابق چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ
ایڈووکیٹ سپریم کورٹ
لاہور

29 اکتوبر 2004

مجھے ظفر اللہ خان کی کتاب کسی اور زمانے کا خواب جستہ جستہ دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میری رائے ہے کہ اس کتاب میں مسلمانوں کی جگانے، بیدار کرنے بلکہ خواب غفلت سے جھنجھوڑ کر ہوش میں لانے کی ایک سنجیدہ علمی کوشش کی گئی ہے۔ ظفر اللہ خان صاحب نے امہ کو درپیش فکری اور علمی چیلنجوں کا بڑا عمدگی سے احاطہ کیا ہے اور ان کا کامیاب جواب دینے کی نہ صرف ضرورت واضح کی ہے بلکہ اس کا طریق کار بھی کھول کر بیان کیا ہے۔ مصنف کی یہ تشخیص مبنی برصداقت ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا بنیادی سبب صدیوں سے ان پر چھایا ہوا فکری جمود ہے اور جب تک وہ اس نجات نہیں پانے ان کی ہمہ جہت پسماندگی دور ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

مصنف نے اسلامی تعلیمات کو دوبارہ سمجھنے اور ان کی تعبیر نو کرنے کی ضرورت پر جو زور دیا ہے اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف کی راہنمائی کے ماخذ قرآن وسنت اور بڑی حد تک اقبال کے افکار ہیں۔ کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے میں نثر میں مسدس حالی کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ وہ بھی ایک کوشش تھی مسلمانون کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور انہیں نئے زمانے کے تقاضوں کی معرفت حاصل کرنے پر آمادہ کرنے کی۔ قرآن نے مسلمانوں کو کائنات پر تدبر کرنے کی جو بار بار تاکید کی ہے مصنف نے اسے خوبصورت پیرائے مین اور جدید انداز میں واضح کیا ہے۔ معیشت، سیاست، ثقافت کے موضوعات پر مصنف نے جو کچھ کہا ہے اس میں مجھے اس کی راسخ فکری شعور کی جھلک نمایاں طور پر دکھائی دی ہے اور میں نے ان کے فہم اسلام کو اپنے فہم اسلام کے بہت قریب پایا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مسلمان سکالر کی ذمہ داری بھی اور پہچان بھی یہ بتائی ہے کہ ان یکون بصیرا بزمانہ یعنی ایک مسلمان عالم کی یہ ذمہ داری بھی ہے اور پہچان بھی کہ وہ اپنے عہد کی بنیادی حقیقتوں سے

آگاہ ہوتا ہے اور اسلام کو سمجھنے کی کوشش کے دوران وہ اپنے زمانے کے حقائق کو پیش نظر رکھتا ہے۔

اقبال نے فقہ اسلامی کی تعبیر نو کی ضرورت بیان کرتے ہوئے **دوام فی التغیر** کے اصول پر بہت زور دیا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ دین کی اساسی تعلیمات کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق احکام اسلام کی تعبیر کی جائے۔ اس کا نام اجتہاد ہے اور یہ بات بالکل درست ہے کہ اجتہاد کا راستہ ترک کرنے کی وجہ سے مسلمان فکری پسماندگی اور عملی زوال کا شکار ہوئے ہیں۔ اب بھی انہیں اگر اپنی عظمت رفتہ کو حاصل کرنا ہے اور دنیا میں عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہنا ہے تو انہیں قرآن کی تعلیمات کو مجتہدانہ سوچ کے ساتھ پڑھنا اور سمجھنا ہوگا ورنہ آج کی طرح ذلت و نکبت ہی ان کا مقدر رہے گی۔

عالم اسلام کی تمام تر زبوں حالی کے باوجود ایسے اشارے موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملت اسلامیہ صدیوں پر محیط خواب خرگوش سے کچھ کچھ بیدار ہو رہی ہے۔ اسے نئے حقائق کا ادراک ہو رہا ہے اور وہ نئے چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے کی فکری علمی اور عملی تیاری کر رہی ہے۔ میری یہ رائے ممکن ہے بعض لوگوں کو درست دکھائی نہ دے لیکن مجھے اس کی صداقت پر پورا یقین ہے اور میرا خیال ہے کہ 21 ویں صدی جوں جوں آگے بڑھے گی عالم اسلام میں شعور اور بیداری کی لہریں تقویت پکڑیں گی اور وہ اپنی عظمت رفتہ کے حصول کی منزل کی طرف قدم بقدم آگے بڑھے گا۔ اس سفر میں ظفر اللہ خان کی زیر نظر تصنیف اور اس جیسی دیگر کتابیں مدومعاون ثابت ہوسکتی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ اس کتاب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ممکن ہو سکے بالخصوص جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں، کالجوں اور جامعات کے طلبا و طالبات، وکلا، علما اور عام مسلمان دانشور طبقے کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ کتاب انہیں سوچ کے نئے زاویئے اور بیداری کا پیغام دے گی۔ میں یہ کتاب تحریر کرنے پر ظفر اللہ خان کی تحسین کرتا ہوں۔

ارشاد احمد حقانی

سینئر ایڈیٹر روزنامہ جنگ لاہور

12 اکتوبر 2004

دین کی حقیقت کیا ہے؟ مسلمان اسے غزالی سے سمجھتے ہیں یا ابن تیمیہ سے یا ابو الاعلیٰ مودودی سے۔ غزالی کی تعبیر پر تصوف کا غلبہ ہے۔ ابن تیمیہ کے ہاں دینی تصورات متفرقات کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ ان کی باہمی نسبتیں دریافت کرنا ان کے پیش نظر ہی نہیں ہوتا۔ ابوالاعلیٰ مودودی دین کو ایک نظام کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور مسلمانوں کی زندگی کا مقصد وحید یہی قرار دیتے ہیں کہ اس نظام کا غلبہ سیاسی لحاظ سے پوری دنیا پر قائم کر دیا جائے۔

یہ تینوں نقطہ ہائے نظر دین کے حقیقی تصور سے کس قدر قریب یا کتنی دور ہیں اور مسلمانوں کے علم و عمل پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں؟

یہ پہلا سوال ہے

ہماری تہذیب کیا ہے؟ اس کے مظاہر جو کچھ بھی رہے ہوں، یہ حقیقت ہے کہ اس کی بنیادی قدر حیا اور حفظ مراتب ہے۔ یہ قدر ہمیں اتنی زیادہ عزیز رہی ہے کہ اس کے لیے ہم اپنی ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ ہماری زبان، لباس، رہن سہن، رسم و رواج، سیاست، معیشت، معاشرت اور تعلیم و تعلم، غرض ہر چیز پر صدیوں اس کی حکومت رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں مغربی تہذیب ہے۔ جس کی بنیادی قدر آزادی ہے اور بالکل اسی طریقے سے اس کی ہر چیز پر حکومت کر رہی ہے، جس طرح حیا اور حفظ مراتب کی قدر ہماری تہذیب میں حکومت کرتی رہی ہے۔

اب کیا کیا جائے؟ اپنی اقدار کی طرف مراجعت کی جائے اور نہیں مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا جائے یا آگے بڑھ کر آزادی کے اس تصور کا خیر مقدم کیا جائے جو جدید ذرائع ابلاغ کی طاقت سے اس وقت پوری قوت سے ہماری طرف پیش قدمی کر رہا ہے؟

دوسرا سوال ہے

مسلمان کہتے ہیں کہ ان کی عظمت کا راز جذبہ جہاد میں ہے اور جہاد سے وہ بالعموم قتال مراد لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ صدیوں پہلے جب وہ عالمی طاقت بنے تھے تو ان کا یہ مقام اسی جذبے کا مرہون منت تھا اور اب بھی اگر دنیا میں انہیں کبھی سرفرازی حاصل ہوئی تو اسی جہاد وقتال کے ذریعے سے حاصل ہو گی۔ ٹیپو سلطان، بخت خان، سید احمد شہید، امام شامل، مہدی سوڈانی اور ملا عمر جیسے مجاہدین ان کے ہیرو ہیں اوان کے اقدامات کی پے درپے ناکامی کے باوجود وہ اب بھی منتظر ہیں کہ انہی کی طرح کوئی مہدی موعود آئے گا اور کافروں سے جہاد کر کے دنیا کی حکومت ان کے حوالے کر دے گا۔ یہ نقطہ نظر صحیح ہے یا اس کے برخلاف مسلمانوں کے زوال کا باعث قرآن سے ان کی بے تعلقی، اجتہاد سے گریز اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے بجائے فلسفہ وتصوف سے ان کے ذہین عناصر کا غیر معمولی اشتغال ہے؟

یہ تیسرا سوال ہے

برادرم ظفر اللہ خان نے یہ کتاب انہی سوالات کے پس منظر میں لکھی ہے۔ ان کی آرا سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن اس بات سے اختلاف نہیں کر سکتے کہ یہ فی الواقع ایک دل دردمند کی صدا ہے۔ کیا حرج ہے کہ جذبات وتعصّبات کو تھوڑی دیر کے لیے ایک طرف رکھ کر ان کی یہ صدا بھی سن لی جائے:

خطا کہیں تو ہوئی ہے اسے بھی دیکھ ذرا
نہیں ہے مردِ مسلماں اگر جلیل و جمیل

جاوید احمد غامدی

المورد، لاہور

20 اکتوبر 2004

ظفراللہ خان ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، باصلاحیت، وضع دار اور صالح نوجوان ہیں۔قدیم اور جدید علوم سے آراستہ ہیں، بلکہ آپ میں دونوں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔خوش پوشاک، خوش گفتار اور خوش اخلاق ہیں۔ ہر ہر چیز میں تستعلیقیت اور نفاست کا اظہار ہوتا ہے۔اعلیٰ علمی اور ادبی ذوق کے مالک ہیں، پہلو میں ایک دردمند دل رکھتے ہیں اور مسلم امہ کی ترقی کے لیے تڑپتے رہتے ہیں۔

آپ اندرون اور بیرون ملک اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں میں تحصیل علم کے باوجود اپنی قدیم روایات، ثقافت اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کے پاسدار ہیں۔آپ نے سول سروس سے قبل از وقت فارغ ہو کر ایک بروقت اچھا فیصلہ کیا ہے۔آپ نے یہ فیصلہ کر کے اپنی خداد صلاحیتوں اور ذہانت کو ایک طرح سے ضائع ہونے سے بچالیا ہے۔

اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات اور دوسری علمی وادبی سرگرمیوں سے وقت نکال کر تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دی ہے۔ اس میدان مین ان کا یہ قدم خوش آئند ہے۔ اس سے قبل ان کی ایک Human Rights منظر عام پر آ چکی ہے۔حقوق انسانی کے موضوع پر اپنی نوعت کی یہ واحد کتاب ہے جو بڑی مفید اور جامع ہے۔علمی حلقوں میں اس کو کافی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

ظفراللہ خان کے بارے میں سب سے بری اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فکر صحیح سے نوازا ہے۔فکر صحیح وہ نعمت ہے جو شاید ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے اور اگر مل جائے تو زندگی کی گھتیاں سلجھتی چلی جاتی ہیں۔آپ کی تازہ تصنیف اسی فکر صحیح کا نتیجہ ہے۔

راقم الحروف کی ایک عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ اس موضوع پر قلم اٹھائے۔ راقم الحروف نے محدود پیمانے پر نجی محفلوں میں لیکچرز اور مضامین کے ذریعے اندرون اور بیرون ملک اس

موضوع کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔لیکن اس موضوع پر ایک بھرپور اور جامع کتاب کی ضرورت تھی۔جس کے لیے بڑی جرات مندی،حوصلہ اور بصیرت کی ضرورت تھی۔

ہمارے ملک کے علما کرام، دانشوروں اور سکالرز کا یہ فرض تھا کہ وہ امت مسلمہ کو ان خطرات سے آگاہ کر کے ان کی رہنمای کرتے جبکہ اس دور میں بڑے بڑے جفادری لکھنے اور بولنے والے منقار زیر پر رہے۔خاموشی ہی کو مصلحت سمجھا۔کسی نے بھی اس سطح پر اجتماعی محاسبہ کی طرف توجہ نہیں دلائی۔جو قومیں انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے محاسبے پر مثبت تنقید کو برداشت نہیں کرتیں وہ ایسی مہلک اخلاقی بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہیں جو بالآخران کی ہلات کا باعث بنتی ہیں۔

زیر نظر کتاب میں مصنف نے بڑی جرات مندی اور بصیرت سے امت مسلمہ کے حالات کا تجزیہ کیا ہے اور غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔صرف نشاندہی پر اکتفانہیں کیا بلکہ ان کے علاج کے لیے تجاویز پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔اس کتاب میں مصنف نے مسلم دنیا کو جھنجھوڑا ہے۔احساس دلایا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیے۔اس کتاب میں بعض مقامات پر مصنف نے بڑی فکر انگیز اور بصیرت افروز باتیں کی ہیں جو قارئین کو دعوت فکر وعمل دیتی ہیں۔یہ ایک قابل ستائش کاوش ہے۔جس کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔

یہ بات حقیقت ہے کہ آج دین کی تشریح وتفہیم اور دعوت کا کام وہ لوگ بہتر طور پر کر سکتے ہیں جو عصری علوم، پبلک لائف اور عملی زندگی کے نشیب وفراز اور تجربات سے آراستہ ہو کر دین کا مطالعہ کرتے ہیں۔اس سے وسعت قلب ونظر پیدا ہوتی ہے جو دین کی تفہیم اور اجتہاد کے لیے بہت ضروری ہے۔راقم الحروف اپنے اس تبصرے کو مصنف کے ان الفاظ پر ختم کرتا ہے:

ہمیں چاہیے کہ اپنی فکر کو صحیح کریں جب تک یہ فکر صحیح نہیں ہوگی ہم ترقی نہیں کر سکتے

پروفیسر ڈاکٹر خالد محمود

اقراء انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن امریکہ

کتابیات

1۔ اقبالؒ، محمد، 'بانگ درا'، سنگ میل، لاہور، 2011

2۔ اقبالؒ، محمد، 'بال جبریل'، تاج کمپنی، لاہور، 1935

3۔ اقبالؒ، محمد، 'ضرب کلیم'، کتب خانہ طلوع اسلام، لاہور، 1936

4۔ اقبالؒ، محمد، 'اسرار خودی'، یونین سٹیم پریس، لاہور، 1915

5۔ اقبالؒ، محمد، 'ارمغان حجاز'، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، 2002

6۔ ابن ماجہؒ، حضرت حافظ ابی عبداللہ محمد بن یزید، 'سنن ابن ماجہ' ترجمہ مولانا محمد قاسم امین، مکتبہ العلم، لاہور، 2010

7۔ احمد بن حنبلؒ، حضرت امام، 'مسند امام احمد بن حنبلؒ' ترجمہ مولانا محمد ظفر اقبال، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، 2004

8۔ ابن کثیرؒ، حافظ عمادالدین ابوالفدا، 'تفسیر ابن کثیر' ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، 2006

9۔ ابن قیمؒ، حافظ ابی عبداللہ محمد، 'زاد المعاد' ترجمہ رئیس احمد جعفری، نفیس اکیڈمی، کراچی، 1990

10۔ ابن ابی شیبہؒ، امام ابی بکر عبداللہ بن محمد، 'مصنف ابن ابی شیبہ' ترجمہ مولانا اویس سرور، مکتبہ رحمانیہ، لاہور

11۔ الازہریؒ، پیر محمد کرم شاہ، 'ضیاء القرآن'، ضیاء القرآن، لاہور، 1995

12۔ بخاریؒ، حضرت امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل، 'صحیح بخاری' ترجمہ حضرت مولانا محمد داؤد راز، مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، دہلی، 2004

13۔ البیہقیؒ، حضرت امام ابی بکر احمد بن حسین، 'سنن البیہقی (شعب الایمان)' ترجمہ مولانا قاضی ملک محمد اسماعیل، دارالاشاعت، کراچی، 2007

14۔ پانی پتیؒ، قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی، 'تفسیر مظہری'، دارالاشاعت، کراچی، 1999

15۔ ترمذیؒ، حضرت امام محمد بن عیسیٰ، 'جامع ترمذی' ترجمہ مولانا افضل احمد، دارالاشاعت، کراچی، 2006

16۔ حافظؒ، محمد شیرازی، 'دیوان حافظ'، پروگریسو بکس، لاہور، 2010

17۔ حلبیؒ، علامہ علی بن برہان الدین، 'سیرت حلبیہ' ترجمہ مولانا محمد اسلم قاسمی، دارالاشاعت، کراچی، 2009

18۔ حمید اللہؒ، ڈاکٹر محمد، 'خطبات بہاولپور'، اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ، اسلام آباد، 2007

19۔ الخطیب التبریزیؒ، حضرت شیخ ولی الدین، 'مشکوٰۃ' ترجمہ مولانا محمد صادق خلیلؒ، مکتبہ محمدیہ، لاہور، 2005

20۔ خان، وحید الدین، ’فکر اسلامی‘، دار التذکیر، نئی دہلی، 2009

21۔ رومیؒ، مولانا جلال الدین، ’مثنوی معنوی‘ ترجمہ قاضی سجاد حسین، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، 2006

22۔ سجستانیؒ، امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث، ’سنن ابوداؤد‘، ترجمہ ڈاکٹر عبد الرحمٰن بن عبد الجبار الفریوائی، مجلس علمی دار الدعوۃ، نئی دہلی، 2008

23۔ شاطبیؒ، حضرت امام ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ، ’الموافقات فی اصول الشریعۃ‘ ترجمہ مولانا عبد الرحمٰن کیلانی، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، 1993

24۔ طبریؒ، امام ابی جعفر محمد بن جریر، ’تاریخ طبری‘ ترجمہ ڈاکٹر محمد صدیق ہاشمی، نفیس اکیڈمی، کراچی، 2004

25۔ علی متقی بن حسام الدینؒ، حضرت علامہ علاء الدین، ’کنز العمال‘ ترجمہ مولانا مفتی احسان اللہ شائق، دار الاشاعت، کراچی، 2009

26۔ فیض، فیض احمد، ’نسخہ ہائے وفا‘، مکتبہ کاروان، لاہور، 2007

27۔ مسلمؒ، حضرت امام ابو الحسین مسلم بن الحجاج، ’صحیح مسلم‘ ترجمہ علامہ وحید الزمان، مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، دہلی، 2004

28۔ مالک بن انسؒ، حضرت امام، ’موطا امام مالک‘ ترجمہ حافظ زبیر علی، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، 2009

29۔ مودودیؒ، سید ابو اعلیٰ، ’تفہیم القرآن‘، الاصلاح کمیونیکیشن نیٹ ورک، لاہور، 1999

30۔ نعمانیؒ، علامہ شبلی؛ علامہ سید سلیمان ندویؒ، 'سیرت النبی ﷺ'، ادارہ اسلامیات، لاہور، 2006

31 ندویؒ، سید ابو الحسن علی، 'انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر'، مجلس نشریات اسلام، کراچی، 1999

32. Encyclopedia Britannica

33. Russell, B. (1976). The Impact of Science on Soceity. London: Routledge Taylor & Francis Group.

34. Briffault, R. (n.d.). The Making of Humanity. London: G.Allen & Unwin Ltd.

35. Bertrand, R. (n.d.). The History of Western Philosophy. London: G.Allen & Unwin Ltd.

36. Hitti, P. (2000). The Arabs: A Short History. London: Macmillan.

37. Sharif, Mian Muhammad. (1963.). A History of Muslim Philosophy. Kempten: Allgauer Heimatverlag.

38. Asad, M. (2005). Islam at the Crossroads. Kuala Lumpur: The Other Press.

39. Asad, M. (2003). The Message of The Quran. London: The Book Foundation

40. Iqbal, Dr. Muhammad. (1934). Reconstruction of Religious Thought in Islam. London: Oxford University Press.

41. Khan, Wahiduddin. (n.d.). Muhammad: A Prophet for All Humanity. New Dehli: Goodword Books.

اس کائنات میں جمود (Inertia) نہیں ہے بلکہ حرکت ہے۔ مستقل حرکت ہے۔ مستقل بہاؤ ہے جس میں کوئی ٹھہراؤ نہیں ہے۔ وقت آگے بڑھ رہا ہے۔ ہر لمحہ ایک نئی دنیا ہے۔ حرکت ہی حرکت ہے جس میں کوئی رکاوٹ ہے نہ کوئی تقسیم۔ اب تو سائنس نے بھی کہہ دیا ہے کہ مادہ بھی مستقل نہیں ہے بلکہ تغیر پذیر (changable) ہے۔ تبدیلی کے خالق نے یہ بھی بتادیا ہے کہ اس تبدیلی کو صرف عقل والے سمجھ سکتے ہیں۔ بے عقل لوگ جامد (motionless) رہتے ہیں۔ حال پر خوش رہتے ہیں۔ تبدیلی کا ساتھ نہیں دیتے۔

تغیر و تبدیلی کا ساتھ دینے کے لیے اسلام نے ہمیں اجتہاد کا تصور دیا ہے۔ معروف (customs) کو ماننے کا تصور دیا ہے۔ ان بنیادی اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے زندگی کی متحرک (dynamic) تعبیر کرنے کو کہا ہے۔ زمانے کے ہر نئے چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کو کہا ہے۔ قرآن و حدیث کی عہدی تعبیر (cotemporal interpertation) کا حکم دیا ہے۔ اگر قرآن و حدیث سے راہنمائی نہ ملے تو عقل و قیاس (inference) سے کام لینے کا حکم دیا ہے۔ یہ دین کا وہ حکم جسے ہم فراموش کر چکے ہیں جس کا نتیجہ مسلمانوں کی زبوں حالی ہے۔

ظفر اللہ خان نے ابتدائی دینی و دنیاوی تعلیم صوفیائے کرام کے شہر ملتان میں حاصل کی۔ ایف اے اور بی اے کے امتحانات پرائیویٹ طور پر ملتان ایجوکیشن بورڈ اور بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے امتیازی پوزیشنوں میں پاس کیے۔ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم ایس سی (بین الاقوامی تعلقات) کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ کچھ عرصہ تک انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں درس وتدریس کے شعبے سے منسلک رہنے کے بعد 1987ء میں سول سروس آف پاکستان کے ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ میں شمولیت اختیار کر لی۔ 1997ء میں سٹی یونیورسٹی لندن سے ایل ایل بی کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ یونیورسٹی آف ویسٹ آف انگلینڈ، برسٹل (برطانیہ) سے 1998ء میں قانون میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ حاصل کیا اور لنکنز ان (لندن) سے بار ایٹ لاء کرنے کے بعد ملازمت سے استعفیٰ دے کر آپ قانون کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ آپ اسلام، قانون اور حقوق انسانی پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ وفاقی سیکریٹری قانون وانصاف بھی رہے۔ آپ آجکل وزیراعظم پاکستان کے خصوصی معاون/ وزیر مملکت برائے قانون وانصاف ہیں۔

Price Rs. --------/-